علامہ اقبال

اپنوں کی نظر میں

مصباح الحق صدیقی

علّامہ اقبالؒ

(اپنوں کی نظر میں)

مُرتّبہ

مصباح الحق صدّیقی

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

طبع ——— اوّل

ناشر ——— فرہان پبلشرز

۱۔ جہان محمد روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

مطبع ——— نور عالم پرنٹرز

کوپر روڈ لاہور

اشاعت ——— جون ۱۹۷۷ء

تعداد ———

قیمت ——— -/۲۵ روپے

ملنے کا پتہ

یونیورسل بکس

ذوالقرنین چیمبرز۔ اردو بازار۔ لاہور

فہرست مضامین

عرض احوال ——— مرتب ۵

اجمالی تعارف ——— سید محمد متین ہاشمی ۷

۱- ابوسلمان شاہجہانپوری — کراچی میں پہلا یومِ اقبال ۹

۲- (حکیم) آفتاب احمد قرشی — اقبال کا پیغام کسان کے نام ۱۹

۳- (میاں) امیر الدین — دانائے راز ۲۷

۴- احمد ندیم قاسمی — ایک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش ۳۳

۵- ڈاکٹر جاوید اقبال — چوہدری محمد حسین ایم، اے ۳۹

۶- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم — علامہ اقبال سے میری پہلی ملاقات ۶۱

۷- مولانا ظفر علی خاں — اقبال — میرا دوست ۷۳

۸- علامہ اقبالؒ — علامہ اقبال کی وصیت جاوید کے نام ۷۷

۹- شیخ عبدالقادر	چند مدبّر گوئیاں	۷۹
۱۰- محمد عبداللہ قریشی	اقبالؒ گاہوں کے کٹہرے میں	۸۳
۱۱- خواجہ عبدالرحیم	مزار اقبالؒ کیونکر بنا	۹۱
۱۲- غلام رسول انہر	میری ڈائری کا ایک ورق	۱۰۳
۱۳- محترمہ مس فاطمہ جناح	اقبالؒ سے میری آخری ملاقات	۱۰۹
۱۴- فیض احمد فیض	اقبالؒ اپنی نظر میں	۱۱۲
۱۵- سید محسن شاہ	اقبالؒ کی باتیں	۱۲۰
۱۶- ڈاکٹر محمد دین تاثیر	علامہ اقبالؒ سے ایک ملاقات	۱۲۵
۱۷- میاں محمد شفیع (م-ش)	اقبالؒ کے شب و روز	۱۳۱
۱۸- مصباح الحق صدّیقی	اقبالؒ کے لطائف	۱۴۱
۱۹- مُلّا واحدی	علّامہ اقبالؒ - چند یادیں	۱۴۷

عرض احوال

علامہ اقبال کو جن حضرات نے بہت قریب سے دیکھا انہوں نے اس عظیم المرتبت شخصیّت کے متعلق مختلف زاویہ ہائے نظر سے اپنے اپنے مشاہدات و تجربات کو مختلف تاثرات کے تحت قلم بند کیا ہے۔ یہ تاثرات پاکستان کے مختلف رسائل و اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ راقم الحروف نے اِن نگارشات کو کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعی کی ہے تاکہ علامہ اقبال کی شخصیّت کے مختلف گوشوں سے عام قارئین خاص طور پر نئی نسل کو متعارف کیا جا سکے۔ میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی اس کا انحصار قارئین کرام کی حوصلہ افزائی پر ہے۔

اس سلسلہ میں اُن اہل قلم حضرات کا ممنون ہوں جن کی نگارشات ان کی اجازت کے بغیر زیرِ ترتیب مجموعہ میں شامل کی گئی ہیں۔

لاہور

مصباح الحق صدیقی

ایم۔ اے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اجمالی تعارف

دیوجانس کلبی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اکثر دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لئے پھرتا رہتا

قالوا عمن تفتش ؟ لوگوں نے پوچھا کسے ڈھونڈتے ہو ؟

قال افتش عن الانسان - اس نے جواب دیا کہ "انسان ڈھونڈ رہا ہوں -"

ہم مصباح الحق صدیقی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے پرانے دفاتر کھنگال کر یہ مجموعہ تیار کیا اور ہمیں ایک خالص ارضی انسان سے متعارف کرایا جس کا فکر عرش نشین تو ضرور تھا لیکن جب کوئی موکل دھوبی محض اس تصور سے زمین پر بیٹھ جاتا - کہ وہ دھوبی ہے تو وہ تلملا اٹھتا اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں - جو جاوید اور منیرہ کا ہی باپ نہ تھا بلکہ نئی نسل کا ہر نوجوان اسے اپنا روحانی اور معنوی باپ سمجھنے میں حق بجانب ہے - وہ شرق و غرب کے فلسفے پر نگاہ تو ضرور رکھتا تھا لیکن

اس کے انگ انگ میں فکرِ قرآنی اور عشقِ مصطفوی اپنی تمامتر بوقلمونیوں کے ساتھ رچا بسا ہوا تھا۔ قرآن کی تلاوت کرتا تو صفحات بھیگ بھیگ جاتے اور جب عزیزوں کی باری آتی تو سخت بیماری کے عالم میں بھی محمد دین تاثیر کا نکاح پڑھانے پہنچ جاتا، کبھی بارگاہ مجددؒ میں باریاب ہے تو کبھی سلطان المشائخؒ کے دربار میں نغمہ زن۔ موچی گیٹ کے کباب فروشوں کی بھی دل دہی کرتا اور اسلامی ملکوں کے علماء وفضلا اور یورپ کے مستشرقین کی بھی علمی پیاس بجھاتا، غرضیکہ اقبال کے روپ میں ایک جہان تھا جو پنہاں ہو گیا، ایک انجمن تھی جو لٹ گئی۔

اس کی شخصیت ایک ہمہ گیر اور بھرپور شخصیت تھی صدیوں کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں یہی وہ افراد ہیں جن کے باطن میں تاریخ اپنا صدیوں کا سرمایہ انڈیل دیتی ہے اسی طرح کے لوگوں کو "فروغ دیدۂ امکاں" اور "حاصل مزرعِ ہستی" کہا جا سکتا ہے۔ دنیا اقبال کے افکار سے استفادہ کر رہی ہے اور عرصہ دراز تک استفادہ کرتی رہے گی۔ عقلی موشگافیاں ہوں گی۔ عشق کے رازہائے سربستہ فاش کیے جائیں گے۔ بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن ہم تو یہی کہیں گے کہ صدیقی صاحب نے بہت اچھا کیا کہ ہمیں ایک انسان سے ملایا جس کی تلاش میں ایک کلبی تو کیا سینکڑوں کلبی چراغ بکف پھر رہے ہیں۔ اور وہ شاہی مسجد کے میناروں کے سایہ تلے آرام فرما ہے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ .....

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجوی
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما ست

سید محمد متین ہاشمی ریسرچ ایڈوائزر
دیال سنگھ لائبریری لاہور۔ مورخہ ۱۳ جون ۷۷ء

ابوسلمان شاہجہانپوری

کراچی میں پہلا یومِ اقبالؒ

۱۹۳۸ء کا ایک یادگار اجلاس

"سرگزشت غزالی" (ترجمہ المنقذ) کے فاضلانہ مقدمہ میں مولانا محمد حنیف ندوی صاحب نے امام غزالی کے بارے میں شیخ مراغی کا قول نقل کیا ہے۔ شیخ مرحوم فرماتے ہیں:

"جب مختلف علماء کا ذکر آتا ہے تو اس سے ذہن ان خصوصیات کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں یا جن کی وجہ سے ان کو دوسروں پر امتیاز حاصل ہے۔ لیکن غزالی کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ ان کا نام آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کسی ایک ہی آدمی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیرِ بحث ہیں جن میں کا ایک ایک علم و فضل کی مستقل بالذات اقلیم کا تاجدار ہے۔"

اگر ہم ان خصوصیات کو معیار اور پیمانہ بنالیں اور برصغیر پاک و ہند میں کسی ایسی جامع شخصیت کو تلاش کریں تو صرف دو شخصیتیں ابن معیار پر پوری اترتی

ہیں ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ

علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کی بے شمار دولتوں اور فکر و نظر کی بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کا نام زبان پر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کسی ایک شخص کا تذکرہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیرِ بحث ہیں اور ان میں سے ہر ایک علم و فضل اور اپنے اخلاقی کمالات میں یکتائے روزگار ہے۔

حضرت علامہ ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت تھے اور اس چیز نے انہیں پاک و ہند کے ہر طبقۂ خیال کا محبوب اور ہر دائرۂ فکر و عمل میں محترم بنا دیا ہے۔ ان کے کمالات و خصوصیات کا نہ صرف آج اعتراف کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی زندگی میں بھی اعتراف کیا گیا۔ پھر ان کی وفات پر ملک نے جس طرح ماتم کیا وہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ اقبال کسی ایک طبقہ کے ترجمان نہ تھے ان کا تعلق کسی خاص مکتبۂ فکر سے نہ تھا۔ لیکن ان کے انتقال پر علم و عمل اور فکر و نظر کے ہر دائرہ میں ان کا ماتم کیا گیا، قوم و ملت کے یہ تمام طبقے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد نظریات کے حامل تھے۔ لیکن اقبال ان سب میں قدر مشترک تھا، اقبال سب کا محبوب تھا۔ اقبال سب کا ممدوح تھا اور اس کے اٹھ جانے کا غم سب کو تھا۔

حضرت علامہ مرحوم کے انتقال پر برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں بے شمار جلسے ہوئے مشاعرے ہوئے اور ان میں رہنمایان ملک و قوم نے تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اپنے رنج و الم کا اظہار کیا۔ شعرا نے درد انگیز نظمیں اور مرثیے پڑھے لیکن افسوس کہ ان کی رودادیں محفوظ نہ کی جا سکیں۔

بہت سے مشاعروں، اجتماعوں اور جلسوں کی رودادیں اخباروں اور رسالوں

میں شائع ہوئی ہوں گی اس لئے اگر تلاش و جستجو کی جائے تو اب بھی بہت سے جلسوں اور مشاعروں کی رودادیں مرتب کرلینا ناممکن نہیں اور یہ اقبالیات کے سلسلے کا ایک ایسا کام ہے کہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ہم کراچی کے ایک تعزیتی مشاعرہ کی روداد پیش کرتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو کراچی نے ۳۰ اپریل (۱۹۳۸ء) کو ۹ بجے شب میں حضرت علامہ مرحوم و مغفور کی یاد میں ایک تعزیتی مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ یہ مشاعرہ خان بہادر محمد دین صاحب کی صدارت میں انجمن کے دفتر میں ہوا تھا۔ اگرچہ مشاعرہ کا کوئی خاص اعلان اور اس کی تشہیر نہیں کی گئی تھی لیکن جس کان میں بھی اس مشاعرہ کی بھنک پڑ گئی وہ کھنچا چلا آیا۔ انجمن کا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی سامعین میں ہندو مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذہبوں اور ملتوں کے لوگ بھی موجود تھے۔

سب سے پہلے منظور احمد افسر امروہوی نے ایک مقالہ پڑھا جس میں علامہ مرحوم کے سوانح حیات اور ان کے کلام کی خصوصیات پر نہایت اختصار کے ساتھ لیکن جامع الفاظ میں روشنی ڈالی۔ آخر میں آپ نے کہا۔

"اقبال ہم سے بچھڑ گئے لیکن ان کی تصانیف لافانی اور جاودانی ہیں۔ ہندوستان میں ہزاروں شاعر پیدا ہوں گے اور فنا ہو جائیں گے لیکن اقبال جیسا شاعر اعظم اور مصلح معظم شاید ہی پیدا ہو۔"

افسر صاحب کے بعد ممتاز ملک نے نہایت سچے تلے الفاظ میں حضرت علامہ کی سیاسی بصیرت کا اعتراف کیا اور حضرت علامہ کے سیاسی افکار پر روشنی ڈالی اور مرحوم کے اندازِ فکر کی بعض خصوصیات کی جانب اشارات کئے۔ ملک صاحب کی تقریر اگرچہ

مختصر تھی لیکن نہایت جامع اور مدلل تھی۔ نیز موقع بموقع حضرت علامہ کے اشعار نے اسے اور بھی مؤثر بنا دیا تھا۔ ملک صاحب کی تقریر کے بعد شعراء نے کلام پیش کیا۔

افسر امروہوی نے ایک نظم پڑھی۔ نظم کا ہر شعر اثر میں ڈوبا ہوا اور حقیقت کا ترجمان تھا۔ بعض شعر خاص طور پر پسند کئے گئے۔ دو شعر درج ذیل ہیں۔

بہ سلسلۂ تحریکِ وطن بہ کثرتِ فکر و رنج و محن!
تھیں جس سے بہت سی امیدیں وہ آج شریکِ حال نہیں
افسوس حکیمِ اُمت کا اس وقت اہم میں اُٹھ جانا!
اب اور کسی میں اے افسر یہ قوتِ استدلال نہیں

اس نظم کے علاوہ آپ نے ایک قطعہ تاریخ وفات بھی سنایا۔

عبدالرحمٰن برق نے علامہ مرحوم کے آخری کلام پر فارسی میں تضمین پڑھ کر سنائی۔ تضمین کا ہر بند شدّت تاثر سے لبریز تھا۔ پھر برق صاحب کے پڑھنے کے انداز نے سامعین کو اور بھی متاثر کیا۔ ایک بند یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

بہ کارے دین و ملت جاں فروشے
زمینائے حجازی قدح نوشے
شہ اقلیم شعرے دلق پوشے
نوائے قلب مسلم را خروشے
چہ دیگر نے نواز آید کہ نا آید

اس تضمین کے علاوہ برق صاحب نے ایک مسدس بھی پیش کیا اس میں علامہ اقبال سے اس عالم جاودانی کے حالات اور ان کی خموشی کا سبب دریافت کرتے ہیں۔

پھر علامہ مرحوم کی زبانی دنیائے دوں اور عالم جاودانی کے فرق کو بیان کرتے ہیں۔ ایک بندۂ اقبالؒ کی زبان میں ملاحظہ فرمائیے۔

مختلف ہے اس جہاں سے وہ جہانِ رنگ و بو
اور تھے واں جام و خم یاں اور ہیں جام و سبو
واں تو تھی پیمانگی ، دیوانگی و ہائے ہو !
بادۂ عرفاں سے اُس جا مست کرتے ہیں وضو
ہیچ اس بادہ کے آگے بادۂ شیراز ہے
یاں کے مستوں کی زباں اعجاز ہے اعجاز ہے

منشی حبیب اللہ حجازی مرزاپوری نے بھی ایک نظم میں اپنے غم و اندوہ کا اظہار کیا اور مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ نظم کے چند اشعار یہ ہیں :-

شاعرِ مشرق تھا وہ کی جس نے اصلاحِ سخن
ماہرِ علم و فن تھا شاعرِ جادو بیاں
فوقیت حاصل ہے اس کی سب پہ قومی رنگ میں
نکتہ سنج و نکتہ فہم و شاعرِ شیریں بیاں
فلسفہ منطق سے ہے لبریز ان کا سب کلام
جزو ہے تاریخ کی ہر نظر ان کی بے گماں
نکتہ رس تھے آپ تھے استادِ فنِ شاعری
پر معانی اور مدلل آپ کا سارا بیاں

آہ تو بے چین ہوگا نام سننے کے لئے
لے تجھے بتلائے دیتا ہوں نہ ہو نالہ کناں
حسرتا واحسرتا نام ان کا سر اقبال تھا
چل بسے دنیا سے وہ آئی قضائے ناگہاں

محمد خاں صغیر چھپینوی نے ایک اردو اور فارسی قطعات تاریخ پیش کئے اور ماسٹر غفار الحق غفار نے ایک نظم میں اپنے جذبات عقیدت پیش کئے۔ سید لیاقت حسین تمنّا میرٹھی نے بھی ایک نہایت عمدہ نظم سنائی۔ اس میں حضرت علامہ مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات، مختلف علوم وفنون میں وسعتِ نظر اخلاقی کمالات اور اسلامیان ہند کی زندگی کے مختلف گوشوں میں ان کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ محمد اسمٰعیل شیخ نے اپنی نظم تعزیت میں اقبال مرحوم کے شاعرانہ مقام اور سیرت وکردار کی عظمتوں کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ہر شعر منتخب اور پوری نظم مرصع تھی اس پر ان کے پڑھنے کے پر اثر انداز نے سامعین کے سوز وگداز اور تاثرات کو اور بھی گہرا کر دیا۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ ع

آہ اے اقبال اے شمع شبستان سخن
تیرے اٹھ جانے سے بے رونق ہے ساری انجمن
تو ہی تو تھا نو بہار لالہ زار شاعری
کیوں نہ روئے خون تیری مرگ پر ہر اہل فن
یہ وہ صدمہ ہے کہ جو ہے دل گداز وسوزِ جاں
یوں تو صدمے روز دیتا ہے ہمیں چرخ کہن

تیرے ہی بانگِ درا کی کارفرمائی ہے سب
کاروانِ قوم راہِ شوق میں ہے گامزن

صادق حسین اجمیری کی پرسوز نظم نے سامعین کے اندوہ وغم کو اور زیادہ کر دیا۔ پوری نظم ہی نہایت عمدہ تھی ان کی نظم کا خاص موضوع حضرت علامہ مرحوم کی علمی و ادبی اور شاعرانہ حیثیت اور علم و ادب کی دنیا کا وہ خلا تھا جو مرحوم کے اٹھ جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ اجمیری صاحب کی نظم کے تمام اشعار حقیقت سے پر اور سادگی کا بہترین نمونہ تھے۔ انہوں نے علامہ مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات اور رہنمایانہ شخصیت سے محرومی کا نہایت مؤثر انداز میں تذکرہ کیا اور حضرت علامہ مرحوم و مغفور کی بخشش و مغفرت کے لئے دعا کی۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ؎

شاعرِ مشرق حکیم وقت شیریں زبان
یعنی وہ اقبال وہ سرِ نہاں کا راز داں
اس زمانہ میں جو تھا سرمایۂ نازِ وطن
مل گیا مٹی میں آج افسوس وہ گنجِ گراں
اب کوئی اقبال سا پیدا نہ ہوگا دہر میں
لاکھ گردش میں رہیں دن رات ساتوں آسماں
ان کے اٹھ جانے سے سونی ہو گئی بزمِ ادب
کیوں نہ روئے خون آنکھوں سے ہر اک پیر و جواں

سید منظور احمد منظور ہمدانی نے اپنی نظم میں حضرت علامہ کی قومی و ملی اور

اسلامی خدمات آپ کی وسیع القلبی اور بے تعصبی پر روشنی ڈالی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

تو حکیم نکتہ داں تھا باخدا اِک مرد تھا
تیرے دِل میں جذبۂ ملی تھا قومی درد تھا
گرمیٔ ایمان نے پھر ان کو زندہ کر دیا
ایک مدت سے مسلمانوں کا سینہ سرد تھا
پھونک دی تو نے دلِ مومن میں روزِ اول کی روح
گبر و ترسا و برہمن کا بھی تو ہمدرد تھا

عابد حسین عابدؔ کی نظم کو سامعین نے خاص طور پر پسند کیا۔ پوری نظم نہایت عمدہ اور بلند خیالات سے معمور تھی آپ نے نہایت عمدگی کے ساتھ فلسفہ مرگ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ قوم کو ہنوز اقبال کی ضرورت ہے۔ نیز دعا کی کہ خدا وہ دِن لائے جب قوم کے ہر فرد کی زبان پر اقبال کا ترانہ ہو۔ آپ کی نظم کے چند اشعار کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حوروں کو آرزو تھی مومن کی شان دیکھیں
یہ مرگ ناگہانی ہے صرف اِک بہانہ
فانی چمن سے نکلا باغ جناں میں پہنچا
تبدیل کر دیا ہے بلبل نے آشیانہ
اپنے کلام میں وہ موتی لٹا گیا ہے
اور دے گیا ہے ہم کو اِک بے بہا خزانہ

ہے قوم کو ابھی تک اقبال کی ضرورت
بے وقت بن گیا ہے وہ موت کا نشانہ
عابد کی یہ دعا ہے وہ دِن خدا دکھائے
ہو قوم کی زبان پر اقبال کا ترانہ

بنی گل صابر رائے پوری نے ایک رباعی اور قطعہ تاریخ پیش کر کے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اوپر سطروں میں جن شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے علاوہ گوہر حسین خاں گوہر۔ عبدالحمید کیف۔ عبدالحمید حمید۔ سید اصغر علی شاہ نظامی وغیرہم نے بھی شرکت کی اور حضرت علامہ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اور اس حادثہ قومی و ملّی اور سانحہ علمی و ادبی پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔

شعراء کے نذرانہ عقیدت کے بعد صدر مشاعرہ خان بہادر محمد دین نے اپنی مختصر سی تقریر میں حضرت علامہ کے کلام کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ مرحوم پیش آنے والے واقعات کو پیش از وقت ہی محسوس فرما لیتے تھے اور علامہ مرحوم کے متعدد اشعار اپنی اس رائے کی تائید میں پیش کئے۔ آپ نے کہا۔ مرحوم کی اس خصوصیت کو محض شاعرانہ خیال آرائی۔ تخیل کا کرشمہ یا عالمانہ بصیرت و دانائی اور فہم و ادراک ہی نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وہ انعام ہے جس سے وہ اپنے خاص بندوں کو نوازتا ہے انہوں نے اپنے اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ولایت کے منصب پر سرفراز فرمایا تھا۔

آخر میں حافظ شریف حسین نے دعائے مغفرت فرمائی یہ مشاعرہ عام مشاعروں کے برعکس نہایت کامیابی اور کامل نظم و ضبط کے ساتھ ۱½ ۱۱ بجے تک جاری رہا تمام

سامعین شروع سے آخر تک نہایت دلچسپی اور خاموشی کے ساتھ شریک مشاعرہ رہے۔ نہ عام مشاعروں کی طرح داد دی گئی۔ نہ واہ واہ کا شور ہوا۔ نہ کسی کا مذاق اڑایا گیا اور نہ آوازے کسے گئے۔ نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ بدنظمی کی شکایت پیدا ہوئی۔ کیا ہندو کیا مسلمان۔ ہر شریک مشاعرہ کے چہرہ سے رنج و غم کے جذبات عیاں اور میر درد کے اس شعر کی گویا تصویر تھا۔

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

اس مشاعرہ کی روداد ماہنامہ تنویر کراچی بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ شمارہ خصوصی اب نایاب ہے موضوع کی مناسبت سے رسالے کے سرورق پر یہ عبارت جلی حرفوں میں درج ہے۔

"ہجرت نامۂ اقبال حق شناس" اس سے ۱۳۵۷ھ برآمد ہوئے ہیں۔ افسر امروہوی کا قطعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں یہ بھی سرورق کی زینت ہے۔

ترک دنیا کے بے ثبات نمود
صاحب حال شاعر مشرق
گفت افسر آہ/۶ تاریخش
آہ اقبال شاعرِ مشرق

۱۳۵۷

جنگ کراچی ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء

حکیم آفتاب احمد قرشی ایم اے

اقبال کا پیغام
کسان کے نام

مارچ ۱۹۳۲ء کے آخری ہفتے میں لاہور میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا مسلم کانفرنس اس دور میں مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاسی ادارہ تھا۔ اجلاس کی صدارت حضرت علامہ اقبال نے کی۔ علامہ اقبال نے بڑا جامع اور پُرمغز خطبہ صدارت ارشاد فرمایا آپ نے کہا :

"برِصغیر پاک و ہند میں اسلام کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار مسلم کاشت کار کی آزادی پر ہے۔ آتش شباب (نوجوان) اور سوز یقین (کسان) کا امتزاج ہونے دیجئے۔ اس سے زندگی کا شعلہ پوری تابانی سے فروزاں ہوگا۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے، ایک نئی دنیا کی تخلیق ہوگی۔" اور پندرہ برس بعد پاکستان کی صورت میں ہمیں یہ دنیا مل گئی۔

علامہ اقبال اس حقیقت سے آشنا تھے۔ کہ ملک کی آزادی کے لئے نوجوان اور کسان میں گہرا تعاون بے حد ضروری ہے۔ جب تک ملک کی تحریک آزادی میں

ملکی کسان نوجوانوں کے دوش بدوش شامل نہ ہوں گے ملک کی آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ اقبال کی حقیقت شناس نگاہوں نے اس امر کا مشاہدہ کرلیا تھا۔ کہ مسلمان دیہاتی اب بھی اسلام کا پرستار ہے۔ دیہات کے مخلص اور جانباز باشندے اپنی حیات آفرین قوت عمل سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کریں گے۔ اور انہوں نے یہ کردار بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

دیہاتیوں کے مسائل

علامہ اقبال نے اپنے خطبہ میں دیہاتیوں کے بعض دیگر مسائل کی نشاندہی بھی کی اور نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ دیہاتیوں کے مسائل کی جانب توجہ دیں۔ علامہ اقبال نے تجویز پیش کی۔ "ملک میں نوجوانوں کی جماعتیں اور رضا کاروں کے ادارے قائم کئے جائیں۔ جو اپنی توجہ خدمت خلق، سماجی اصلاح، قصبات اور دیہات کی جانب بالخصوص مبذول کریں۔ جہاں مسلم کاشت کار قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ اور ان کے حالات ناقابلِ برداشت صورت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ سائمن کمیشن نے تسلیم کیا ہے۔ کہ کاشت کار اپنی آمدنی کا معتدبہ حصہ حکومت کو ادا کرتا ہے۔ حکومت نے کاشت کاروں کے لئے امن وامان، تجارت اور مواصلات کا انتظام کیا ہے۔ مگر" ان برکات" کا نتیجہ یہ نکلا کہ کارخانوں کے تیار کردہ مال نے دیہی معیشت کو برباد کردیا۔ کاشت کار ساہوکار اور آڑھتی کا محتاج ہے۔ یہ مسئلہ پنجاب میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نوجوانوں کی جماعتیں اس مسئلہ کی جانب خصوصی توجہ دیں۔ اور کاشت کاروں کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلائیں"

علامہ اقبالؒ کو کسانوں سے گہری وابستگی تھی، وہ کسانوں کے مسائل پر غور و فکر کیا کرتے تھے اور ان کی ترقی کے لئے تجاویز سوچتے علامہ اقبال کی رائے تھی کہ برصغیر پاک و ہند کو کاشتکاروں کی سرزمین کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے جو بھی آئینی ترقیاتی تجویز مرتب ہونی چاہیئے۔ اس میں کاشتکاروں کے مفاد کو اولین حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔

کونسل میں

۱۹۲۶ء میں علامہ اقبال کو لاہور شہر کی جانب سے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ممبر منتخب کیا گیا کونسل کا رکن ہونے کی حیثیت سے انہوں نے دیہاتی مسائل پر متعدد بار اظہار رائے کیا۔ دیہاتی عوام کے مصائب آشکار کئے اور حکومت کی توجہ دیہات کی جانب مبذول کرائی، انہوں نے فقط تنقید یا نکتہ چینی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دیہی ترقی کے لئے ٹھوس تجاویز بھی پیش کیں۔

علامہ اقبال کو مفکر پاکستان کی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کی چشم تخیل نے پاکستان کے جمال جہاں آرا کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔ اس بنا پر علامہ اقبال کی یہ تجاویز پاکستان کے دیہات کی ترقی کے سلسلہ میں شمع ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تعمیری تجاویز ترقی دیہات کے منصوبوں کی اساس کا کام دے سکتی ہیں۔

علامہ اقبال نے ۵ مارچ ۱۹۲۷ء کو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے حکومت کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ مالیہ بھی انکم ٹیکس کی طرح وصول کرنا چاہیئے۔ ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے دوبارہ اسی مسئلہ پر اظہار رائے کیا۔ علامہ نے فرمایا کہ مالیہ کا موجودہ طریق کار انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ کاشتکار

بھی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے مالیہ کا نظام انکم ٹیکس کی بنیادوں پر استوار کرنا چاہیئے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ پانچ بیگھے تک زمین کے مالکوں سے مالیہ وصول نہیں کرنا چاہیئے۔

ضلع منٹگمری میں نیلی بار کے علاقے میں تین لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین زمینداروں اور سرمایہ داروں کو فروخت کی گئی۔ مگر مزارعین کو نظر انداز کر دیا گیا۔ علامہ اقبال نے مطالبہ کیا کہ فروخت ہونے والی سرکاری زمینوں میں نصف زمین مزارعین کو آسان شرائط پر ملنی چاہیئے۔ دیہات میں طبی امداد کا مناسب انتظام نہیں تھا۔ بیس بیس ہزار دیہاتیوں کے لئے ایک ڈاکٹر تھا۔ سینکڑوں دیہاتی دوا کے میسّر نہ آنے سے لحد کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو جاتے تھے۔ علامہ اقبال نے کونسل میں تقریر کرتے ہوئے حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا کہ دیہات میں صحت و صفائی کا مناسب انتظام ہونا چاہیئے۔

علامہ اقبال نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا کہ مالیہ میں کمی کی جائے اور اس مقصد کے لئے نظم و نسق کے بڑھتے ہوئے اخراجات میں تخفیف کی جائے۔

علامہ اقبال نے یہ تجویز پیش کی کہ موت ٹیکس عائد کیا جائے۔ اور اگر کوئی شخص بیس ہزار یا تیس ہزار روپیہ سے زیادہ کی مالیت کی جائیداد وراثت میں حاصل کرے تو اس پر ٹیکس عائد کیا جائے۔

دیہات کے بارے میں مندرجہ بالا تجاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے دیہی مسائل کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا اور انہوں نے بڑی حقیقت پسندانہ تجاویز پیش کی تھیں۔

کسانوں سے محبّت

علامہ اقبال کسانوں سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ وہ اس قدر بڑے عالم تھے مگر جب کوئی دیہاتی اُن کی خدمت میں پہنچتا تو وہ اس کی قابلیت کے مطابق گفتگو کرتے، وہ گھر پر دھوتی پہنتے تھے۔ اور حُقّہ کے بڑے شائق تھے۔ ہیر وارث شاہ اور خواجہ فرید کی کافیوں کو بہت پسند کرتے تھے اور انہیں اکثر سُنا کرتے تھے۔ وہ کسانوں کے خلوص، جفاکشی اور اسلام دوستی کے بے حد مداح تھے۔ علامہ اقبال ان عناصر سے بے حد نفرت کرتے تھے جو کسانوں پر ظلم و ستم کرتے تھے یا کسانوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان عناصر میں ساہوکار، جاگیردار اور نام نہاد مذہبی پیر شامل تھے۔

علامہ اقبال اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ پنجاب سرحد اور سندھ کے زرعی صوبے بمبئی اور یوپی کے ہندو سرمایہ داروں کی منڈیاں ہیں اور مسلم صوبوں کے زرعی مفادات ہندو سرمایہ داروں کے صنعتی مفاد پر قربان کر دیئے جاتے ہیں۔ نیز ساہوکاروں کی چیرہ دستیوں سے مسلمان کاشتکار غریب سے غریب تر ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے افلاس کا علاج بھی علامہ مرحوم کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ غور و فکر کے بعد علامہ اقبال اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے افلاس کا حل آزاد اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ جس میں اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے۔ اس کی تصریح علامہ اقبال نے ان خطوط میں کی ہے جو انہوں نے قائدِ اعظم کے نام لکھے۔

شعر

علامہ اقبال نے کسانوں کے بارے میں اشعار بھی لکھے ہیں، یہ اشعار کسانوں

کے بارے میں اقبال کے دِلی تاثرات کا اظہار ہیں۔ اقبال کسان کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔
اور حسب ذیل اشعار میں کسانوں کو اپنا پیغام دیتے ہیں ؎

بتا کیا تیری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاکباز
اسی خاک میں دب گئی تری آگ
سحر کی اذان ہو گئی اب تو جاگ

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کے لئے یہ بات سوہانِ روح تھی کہ کسان اپنی حقیقت سے آشنا نہیں ہے اور اسے اپنی اہمیت کا پورا احساس نہیں ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

؎ آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقان ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو۔ باران بھی تو۔ حاصل بھی تو
آہ۔ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفان سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچہ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہوگیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

میاں امیر الدین

دانائے راز

علامہ اقبال سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تو میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایک دِن میں گھر سے باہر نکل رہا تھا تو کسی نے مجھے بتایا کہ علامہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اس وقت وہ موٹر سے اتر رہے تھے۔ ان کا لباس مجھے یاد نہیں رہا۔ مگر ان کے چہرے اور آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ میں وہیں کھڑا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ یہ غالباً ۱۹۰۴ء سے بھی پہلے کی بات ہے۔

اس کے بعد انہیں کئی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ مگر مجھ پر ان کی عظمت کا ایسا رعب طاری تھا کہ کبھی گفتگو کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ رعب دُور ہوتا گیا اور میں اکثر اُن کے ہاں آنے جانے لگا۔ اسی دوران میں، میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا۔ علامہ صاحب بھی وہاں پروفیسر تھے۔ اس لئے

مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے زیادہ مواقع ملنے لگے - بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے بعد بالالتزام ان کے ہاں جاتا رہا اور علم وحکمت کے ان گراں بہا موتیوں کو چننے کی سعادت حاصل کرتا رہا - جو اس بارگاہ میں بہت آسانی سے ہاتھ آتے تھے -

علامہ اقبال کے کلام اور فلسفے کے متعلق بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں ، لکھی جا رہی ہیں ، اور لکھی جائیں گی ، مگر ان کی شخصیت اور سیرت کے متعلق ابھی زیادہ نہیں لکھا گیا - وہ اپنی سیرت اور کردار کے لحاظ سے بھی بہت بڑے آدمی تھے - مجھے تسلیم ہے کہ اس سلسلے میں بھی بہت سی کہنے والی باتیں کہی گئی ہیں مگر بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ابھی تک لکھی نہیں جا سکیں - اس مضمون میں ، میں چند ایسی ہی باتوں کا ذکر کروں گا ممکن ہے ان میں ادبی چاشنی نہ ہو اور مجھے اس کا دعویٰ بھی نہیں مگر مجھے تو ایک فرض ہی ادا کرنا ہے اور میں اسے ادا کرنے کی کوشش کروں گا -

علامہ صاحب کے کردار کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو ہمیشہ قومی مفاد پر قربان کر دیا کرتے تھے - ان کی ساری زندگی اس بات کی گواہ ہے مگر میں صرف ایک ہی واقعہ بیان کروں گا - ان دنوں غالباً وہ بیمار تھے - اگر میں غلطی نہیں کرتا تو شائد ان کا گلا بیٹھا ہوا تھا - بہرحال انہی دنوں میاں فضل حسین نے مجھے ایک خط لکھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ علامہ صاحب عثمانیہ یونیورسٹی میں آٹھ لیکچر دیں - اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان لیکچروں کے موضوع کا انتخاب بھی علامہ صاحب پر چھوڑ دیا جائے جس موضوع کو وہ پسند فرمائیں - اسی پر لیکچر تیار کر لیں - خط کے آخر میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ ان لیکچروں کے معاوضے میں انہیں دس ہزار روپے کی رقم پیش کی جائے گی - یہ خط لے کر میں علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ذاتی طور پر بھی درخواست کی کہ اس

پیش کش کو قبول کر لیا جائے۔ علامہ صاحب یہ سُن کر تھوڑی دیر خاموش رہے ۔ جیسے اپنے ذہن میں کوئی مخاص فیصلہ کر رہے ہوں۔ پھر یکایک سر اٹھا کر بولے "میں یہ پیشکش ضرور قبول کر لیتا۔ مگر انہیں دنوں میں فقہ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ جو قوم کے لئے ایک اہم اور مفید چیز ثابت ہو گی۔ اس لئے جب تک یہ کام ختم نہ ہو جائے۔ میں کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ آپ میری طرف سے لکھ دیجئے کہ میں یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔"

ظاہر ہے کہ ان کا یہ فیصلہ قطعی تھا مگر میرے اصرار پر وہ اتنا مان گئے کہ اس سلسلے میں میاں فضل حسین سے ذاتی طور پر خط و کتابت کر لیں۔ مگر اس طویل خط و کتابت کا نتیجہ بھی وہی نکلا۔ یعنی انہوں نے یہ پیش کش قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔

علامہ صاحب کو نبیٔ کریم صلعم سے سچّا عشق تھا۔ آنحضور کا نام سنتے ہی ان پر لرزہ سا طاری ہو جاتا اور اسی حالت میں آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ ایک مرتبہ کسی غیر مسلم نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ خود اتنے بڑے فلسفی اور حکیم ہیں۔ آخر آپ مجھے یہ تو بتائیں کہ وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو پیغمبرِ اسلام کا اس قدر شیدا بنا دیا ہے علامہ صاحب یہ سُن کر قدرے جوش سے بولے آپ کو شاید معلوم نہیں کہ جب نبیٔ کریم نے نبوت کا اعلان کیا اور لوگوں سے پوچھا کہ کیا میں نے آج تک کبھی جھوٹ بولا ہے تو تمام لوگوں نے متفقہ طور پر اور یک زبان ہو کر کہا تھا کہ نہیں۔ ہم نے کسی ایک موقعہ پر بھی آپ کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ کیا یہی ایک واقعہ نبیٔ کریم کی عظمت پر ایمان لانے کے لئے کافی نہیں۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

علامہ صاحب کی عظمت کا صحیح احساس ان کے قریب پہنچ کر ہی ہوتا تھا۔ ان کے

گھر کے دروازے سب پر کھلے ہوئے تھے۔ بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب میں کوئی تمیز نہ تھی۔ جس کا جی چاہتا بلا تکلف ان کے ہاں چلا آتا اور گھنٹوں بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہتا۔ ان کی شخصیت جاڑے کے موسم میں جلتی ہوئی اس آگ کی طرح تھی جس کے قریب پہنچ کر آدمی ایک خاص قسم کا فرحت بخش سکون محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کے دِل میں کچھ کر گزرنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔

علامہ صاحب کا ایمان تھا کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کی پس ماندگی کی سب سے بڑی وجہ ان کا اسلام سے انحراف تھا۔ وہ اسلام کو ایک حیات افروز قوت سمجھتے تھے اور صرف اسی کو مسلمانوں کی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں ڈاکٹر انصاری کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تو انہوں نے ایک خط میں انہیں لکھا کہ آپ کو یہ وہم تو نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام ہماری نجات کا ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتا؟ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر انصاری نے اس کے جواب میں فوراً ہی علامہ صاحب کو یقین دلایا کہ ان کے کانگرس کی صدارت قبول کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے۔ وہ اس بارے میں علامہ صاحب کے ہم خیال ہیں۔

علامہ صاحب قائدِ اعظم کے بے حد مداح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ دَور میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے محمد علی جناح سے موزوں اور کوئی آدمی نہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مجھے خاص طور سے یاد ہے۔ ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو علامہ صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ میاں افتخار الدین بھی تھے۔ جو ان دنوں کانگرس سے وابستہ تھے۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کمرے میں داخل ہوئے اور علامہ صاحب کی چارپائی کے ساتھ

لگ کر فرش پر بیٹھ گئے۔ اس پر علامہ صاحب نے انہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا میرے لئے یہی جگہ موزوں ہے۔ مگر بعد میں علامہ صاحب کے اصرار پر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

اس ملاقات میں بہت سے مسائل پر بات چیت ہوئی اور آخر کار گھوم پھر کر قائدِ اعظم کی ذات زیرِ بحث آ گئی۔ اس موقعہ پر علامہ صاحب نے قائدِ اعظم کی بہت تعریف کی تو غالباً یہ بات میاں افتخار الدین کو کچھ ناگوار گزری اور وہ علامہ صاحب سے مخاطب ہو کر بولے۔

"ڈاکٹر صاحب، مسلمانوں میں آپ کو جو اثر و رسوخ حاصل ہے اور جس طرح وہ آپ کی بات مانتے ہیں، وہ حیثیت مسٹر جناح کو حاصل نہیں ہے۔ پھر کیوں نہیں آپ خود آگے بڑھتے اور مسلمانوں کی قیادت سنبھال کر کانگرس سے کوئی پیکٹ کر لیتے۔" علامہ صاحب اس وقت تکیئے سے ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سُن کر وہ ایک دم اُٹھ بیٹھے اور بڑے جوش سے بولے۔

"تم اُسے نہیں سمجھ سکو گے۔ اسلام میں اطاعت امیر مقدم ہے۔ جناح ہی مسلمانوں کا صحیح لیڈر ہے اور اگر کانگرس مسلمانوں سے بحیثیت قوم کوئی پیکٹ کرنا چاہتی ہے تو قوم کی طرف سے اس معاہدے پر دستخط کرنے کا حق صرف جناح کو ہے۔ میں تو صرف ایک سپاہی ہوں۔ یاد رکھو، میں صرف ایک سپاہی ہوں۔"

یہ سُن کر میاں صاحب تو سناٹے میں آ گئے، مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے علامہ صاحب کے جواب کی بہت ہی تعریف اور تائید کی۔

علامہ صاحب دورِ حاضر کے تمام مسائل پر حکیمانہ نظر رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں

بہت دُور رس تھیں اور ان کی نگاہوں پر وہ تمام راز منکشف تھے جو ایک عام آدمی پر کبھی نہیں کھل سکتے۔ جب وہ زندہ تھے تو ان کی باتیں سُن کر آدمی سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے ؟ کیا یہی ہونے والا ہے ؟ مگر حالات ـــــ اور حالات خواہ کچھ بھی ہوتے، ہوتا وہی تھا جو وہ کہتے تھے۔ بے شمار باتیں ہیں جو کئی سال پہلے انہوں نے کہی تھیں اور اب تک، پوری ہو چکی ہیں۔ بے شمار باتیں ہیں جو انہوں نے کہی تھیں مگر ابھی وہ عالمِ وجود میں نہیں آئیں، مگر مجھے پختہ یقین ہے کہ وہ ضرور پوری ہوں گی۔ کیوں ؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے شائد اس کے لئے ایمان شرط ہے۔

علامہ صاحب کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ خطرناک باتیں ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے بارے میں لکھنا بڑے جی گُردے کا کام ہے۔ یوں لکھنے کو سینکڑوں باتیں ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کون کون سی بات لکھی جائے، اور کس ترتیب سے لکھی جائے پھر یہ بھی ہے کہ اتنی عظیم شخصیت کے متعلق لکھتے ہوئے ہر لمحہ اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوتا ہے۔ کہاں وہ لامحدود سمندر کہ جس کی تہہ میں جا بجا گوہر نایاب بکھرے پڑے ہیں اور کہاں ایک غوطہ خور جو ایک غوطے میں مشکل سے چند موتی چُن سکتا ہے۔

کاش میں چند موتی اور چن سکتا !

احمد ندیم قاسمی

اِک مردِ قلندر نے کیا

رازِ خودی فاش

اور یہ مردِ قلندر راز خودی فاش کر کے الگ نہیں ہو گیا تھا بلکہ اس نے خودی کی پرورش اور خودی کی نمود کے رازوں پر سے بھی پردے اٹھا دیئے تھے۔ لیکن کوتاہ اندیش زمانہ صرف اس کے فلسفۂ خودی کو لے اُڑا۔ مغرب کے فلسفیوں سے اس کی عظمت کا مقابلہ کیا، قدیم عربی حکیموں سے اس کے نظریۂ خودی کا موازنہ کیا اور فخر سے تن گیا کہ ہمارا اقبالؔ بہت بڑا فلسفی تھا۔ ہمارا اقبالؔ اپنے زمانہ کا ذہنی مجتہد تھا — فخر و مباہات کا اظہار کتابوں، تقریروں اور 'ریوموں' کی صورت میں کیا گیا۔ لیکن خودی کی پرورش و نمود کے سلسلہ میں اقبال کے شیدائیوں نے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔ آزاد پاکستان میں زندگی کی تمام پاکیزہ قدریں خاک اور خون میں لتھڑی پڑی رہیں۔ تمام سیاسی، سماجی اور اخلاقی معیاروں

کو روندا اور لتاڑا جاتا رہا۔ یہاں کے ماحول میں وہ فرنگی استعمار ذرا اور شدّت سے رچ گیا۔ جس کے خلاف اقبال نے تمام عمر جہاد کیا۔ جسے اقبال نے خودی کی موت قرار دیا۔ اور جس کی مسلسل اور مستقل مخالفت نے اقبال کو اجنبی حکومت کا معتوب بنائے رکھا۔ آج ہم اس کے فلسفۂ خودی پر فلسفے پڑھتے اور سنتے ہیں لیکن ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اب تک دہقان کو کھیت سے روزی میسّر نہیں۔ اب تک ہمارے چار طرف مرمر کی سِلوں کی چار دیواریاں اُبھری ہوئی ہیں۔ اب تک ہم برطانوی اور امریکی تہذیب کی کارگہ شیشہ گراں میں رہتے ہیں۔ اب تک پیر کا گھر بجلی کے چراغوں سے بقعہ نور بن رہا ہے اور سریہ کو مٹی کا دِیا تک میسّر نہیں۔ اب تک یہاں کے بورژوا نوجوانوں کی تن آسانی افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں کی محتاج ہے۔

اب تک اس دیس کے بندے کامن ویلتھ کی غلامی پر رضامند ہیں۔ اب تک اقبال کی یہ صدا اربابِ حکومت کے ایوانوں، بڑے بڑے آستانہائے مبارک کے ایوانوں عالیشان مسجدوں اور ان وسیع ہالوں میں جہاں یوم اقبال منعقد ہو رہے ہیں گونج رہی ہے، مسلسل گونج رہی ہے۔ ع

بآدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی

اقبال کی تعلیم کا یہ کتنا غلط تصوّر ہے کہ اس کے کلام کے ذریعے آدمیّت کو چند ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ثابت کیا جا رہا ہے کہ اقبال صرف ایک فرقے، صرف ایک قوم کا شاعر تھا۔ وہ اقبال کے چند شعروں کی تاویل کر کے بڑی بڑی تقریریں کر ڈالتے ہیں۔ مگر اقبال کے یہ اشعار

ایک بار بھی نہ ان کی تقریروں میں وارد نہیں ہوتے اور ان کی تحریروں میں بار نہیں پا سکتے ؎

حرف بد را بر لب آوردن خطا ست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا ست
آدمیت احترامِ آدمی　　باخبر شو از مقامِ آدمی

میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ اس اقبال کو ہماری نظروں سے التزاماً پوشیدہ رکھا جا رہا ہے، جو ہماری آنے والی نسلوں کا محبوب شاعر قرار پائے گا۔ اور اس اقبال کو انتہا درجہ کی عاقبت نا اندیشی سے اچھالا جا رہا ہے، جو اپنے وقت، اپنے ماحول اور اپنے حالات کے ماتحت چند محدود قسم کے نظریات اپنانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں اس کا یہ عمل کسی صورت میں رجعتی نہیں تھا لیکن ہر اچھے شاعر کی ہر نظم، اور ہر شعر کو قیامت تک کے تاریخی و معاشرتی اور معاشی انقلابات پر چسپاں کرنے کا مشغلہ بے حد پھسپھسا اور بے جان ہے۔ نوجوان نسل کا فرض ہے کہ وہ اقبال کے فلسفے کے نشیب و فراز اور یونانی و اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں اُلجھنے کی بجائے اس اقبال کو عوام کے سامنے لے آئے جو ساری آدمیّت کا نمائندہ تھا۔ جس کے دل میں طبقاتی سماج کے خلاف بے انتہا نفرت موجود تھی۔ جس کا دل دہقان کی زبوں حالی دیکھ دیکھ کر بے شمار مرتبہ بُری طرح دُکھا تھا۔ جس نے فلسفہ خودی کو محض ایک نئے نظریئے کی صورت میں پیش نہیں کیا تھا بلکہ اس کی لذیذ ترین تمنّا یہ تھی

کہ اس کی قوم کا ہر انسان خود شناس وخود آگاہ ہو اور وہ صرف برسرِ اقتدار طبقہ کے احکامات کی پیروی ہی کو معراجِ حیات نہ سمجھے - بلکہ اپنی ذات سے کبھی غافل نہ رہے - اور اپنی ذات کو کائنات کے ساتھ کچھ اس طرح متعلق رکھے کہ دنیا کے تمام خود آگاہ انسان آدمیت کا ایک ناقابلِ شکست محاذ بن جائیں - اقبال نے اپنے جگر گوشہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

منکرِ حق نزدِ ملّا کافر است　　منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر　　پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

میں اس دِن کے انتظار میں ہوں جب اقبال کے شیدائیوں کو اچانک اس حقیقت کا تلخ احساس ہوگا کہ اب تک اونچے محدود طبقے نے اقبال کو بُری طرح ایکسپلائٹ کیا ہے - اور اقبال ہی سے اپنے ظالمانہ ومتشددانہ اقدامات واحکامات کی تاویلیں بٹوری ہیں - آج اقبال کو نہایت ناواجب انداز میں استعمال کیا جارہا ہے نوجوان طبقے کے دلوں میں تعصب کا زہر بھرنا یقیناً اقبال کا مقصد نہیں تھا - اقبال کا یقیناً یہ مقصد نہیں تھا کہ رنگ و نسل کے امتیازات کا تیرہ چودہ سو برس تک مضحکہ اڑانے والے مسلمانوں کے ذہنوں پر اچانک نسلی امتیاز کا بھوت سوار ہوجائے - اور پھر اقبال یقیناً یہ نہیں چاہتا تھا کہ سات کروڑ مسلمان عوام کی آواز کو محض اس لئے قدم قدم پر دبایا جاتا رہے کہ عوام کی بہبود الحاد کا پیش خیمہ ہے اور غیر انسانی سرمایہ داری وجاگیرداری ہمیں سیدھی خدا پرستی کی طرف لے جاتی ہے - اپنی تہذیب اپنے تمدّن اور اپنی اخلاقی قدروں کے تحفظ کا یہ طریقہ اقبال

کے ذہن میں نہیں تھا کہ یہاں ایک خالص فسطائی نظام، یا بہ قول جاوید اقبال صاحب اِک نیم فسطائی اسلامی نظام[1] قائم کیا جائے۔ بلکہ اقبال تو افراد کے دِلوں میں خودی کی پرورش و نمود کے بعد جماعت کا علمبردار تھا۔ اور یہی اجتماعی تصوّر تھا جس نے اسے ہر حساس طبقے کا محبوب بنا دیا۔

آج اقبال کا یوم منانے کے لئے بڑے بڑے لوگ بہت دُور دُور سے آرہے ہیں۔ خاک نشینوں کو اس تقریب میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ وہ فلسفہ کی بحثوں میں اُلجھنے اور اپنے عِلمی تبحّر کا سِکّہ بٹھانے کی بجائے یک آواز ہو کر اقبال کی اس قسم کی نظمیں گاتے ہیں:۔

ع موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز

اور 〃 خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب

اور 〃 اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اور یہ سات کروڑ عوام کا باہم گایا ہوا نغمہ ایک عالمگیر گونج بن کر ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ اور اقبال کے نظریہ تصوّف اور مابعد الطبیعاتی رجحان کے بارے میں علمی موشگافیاں کرنے والوں کو اچانک اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اقبال نے عوام کو فراموش نہیں کیا بلکہ اس کا فلسفہ خودی ان ہی کروڑوں اربوں انسانوں کے لئے تھا جنہوں نے اپنی محنت، اپنی قوت، اپنی جوانی، اور اپنی زندگی جاگیرداروں اور شہنشاہوں کے پاس گروی رکھ کر بدلے میں چند نوالے پائے تھے۔ اور یہ بھُول بیٹھے تھے کہ دراصل وہی اس دھرتی کی

---

[1] یہ راز ایک ملاقات میں، اور پھر ان ہی کی زبانی ان کا ایک مقالہ سن کر مجھ پر منکشف ہوا۔ (ندیم)

رونق اور اسی کائنات کے لاڈلے ہیں۔ اقبال کے یہ اشعار آج بھی، پاکستان میں بھی، آج سے کئی برس پیشتر کی طرح ہم پر صادق آتے ہیں ؎

ہم مسلمانان افرنگی مآب　　چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرِّ دیں اند ایں ہمہ　　اہلِ کیں اند اہلِ کیں اند ایں ہمہ
خیر و خوبی بر خواص آمد حرام　　دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

جب اقبال کے اس فلسفہ پر سے نقاب اٹھیں گے، جو ان اشعار میں پوشیدہ ہے تو اس وقت اقبال کا مشن پورا ہو گا اس وقت خودی کی پرورش و نمود اپنے جوہر دکھائے گی اور اسی وقت جمہور ع

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

گانے والے اپنے محبوب شاعر کی یاد میں ایسی ایسی تقریبیں منعقد کریں گے جن کی روداد صدیوں تک مستقبل کی تاریخ کو جگمگاتی رہے گی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

چوہدری محمد حسین ایم اے

حکیم الاُمّت کے دستِ راست

علامہ اقبال کی ایک یادداشت وہ کتاب ہے جس کے پہلے صفحہ پر اُنہوں نے لکھا ہے۔ "جاوید اقبال کو لازم ہے کہ بالغ ہونے پر اس تمام تحریر کو جو اس کتاب میں درج ہے بغور پڑھ لے۔ محمد اقبال ۱۰۔ جون ۳۵ء"۔ اسی کتاب میں ۱۷۔ اکتوبر ۳۵ء کی یادداشت کے تحت وہ اپنی اُس وصیّت کا ذکر کرتے ہیں جو سب رجسٹرار کے دفتر میں رجسٹر کرائی جا چکی ہے اور فرماتے ہیں "اس وصیّت کی رُو سے چودھری محمد حسین ایم۔ اے، منشی طاہر دین، شیخ اعجاز احمد و خواجہ عبدالغنی کو جاوید اور منیرہ کی جائداد اور ذات کا ولی مقرر کیا گیا ہے"۔ آگے چل کر تحریر کرتے ہیں۔ "باقی جاوید کو میری عام وصیّت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے ..... جو لوگ میرے احباب ہیں ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھے اور اُن سے اپنے معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔"

حضرت علامہ کے احباب کی تعداد خاص طور پر ان کی وفات کے بعد تو بہت بڑھ گئی ہے۔ اور اب اُن میں کچھ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جو علامہ پر دینِ اسلام کے اسرار و رموز واضح کیا کرتے تھے۔ انہیں بتایا کرتے تھے کہ شعر کس طرح کہا اور لکھا جاتا ہے۔ اور بعضوں نے تو یہ دعویٰ بھی کر دیا ہے کہ علامہ اپنی زندگی ہی میں انہیں اپنا نائب مقرر کر گئے تھے گو جب علامہ بقیدِ حیات تھے تو ان کے ان احباب کی خوبیاں اتنی عیاں نہ تھیں جتنی اب ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے میں غلطی پر ہوں کیونکہ میں نے علامہ کے بیشتر ملنے جلنے والوں کو بہت چھوٹی عمر میں دیکھا ہے۔ ایسی عمر میں جب کہ مجھے ہر شے بہت بڑی اور ہر شخص بہت قد آور دکھائی دیتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے زمانہ نے کروٹ بدل لی ہے اور اب اگر میں کبھی علامہ کے ان احباب کو ملتا ہوں تو تعجّب ہوتا ہے یہ لوگ تو مجھے بہت قد آور نظر آیا کرتے تھے۔ اب اس قدر ٹھگنے سے کیوں معلوم ہونے لگے ہیں کہ انہیں دیکھنے کے لئے مجھے اپنی کمر جھکانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ عجیب بات ہے میں نے آج تک علامہ کے احباب کی موجودگی میں یہ کبھی نہیں سوچا کہ میں خود قد میں بڑھ گیا ہوں۔ بہرحال علامہ کے جس دوست کا تذکرہ مجھے یہاں مقصود ہے وہ میری زندگی کے ہر رنگ میں، ہر حال میں اور ہر دَور میں مجھ سے قد میں اُونچا ہی رہا اور جب کبھی بھی میں نے اس طرف دیکھا مجھے اپنی نگاہیں اٹھانی ہی پڑیں، جھکانی نہ پڑیں۔

چودھری محمد حسین ایک ایسے بزرگ تھے جو رفتہ رفتہ اب ہم لوگوں میں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ گندمی رنگ، چھ فٹ ایک انچ قد۔ قوی ہیکل جسم۔ چھدری سی خاکستری داڑھی۔ دھندلی سی مگر ایک ہی جائزے میں انسان کو بھانپ لینے والی

نگاہیں۔ رُومی ٹوپی اوڑھے، سفید شلوار اور سفید قمیض پر ہاف کوٹ پہنے، ادھیڑ عمر کے ایک وضع دار کم گو۔ بظاہر سرد مہر لیکن حقیقت میں پُرخلوص۔ دیکھنے میں سادہ لیکن سمجھنے میں مشکل شخص جو بائیسکل کی گدّی پر ہمیشہ پچھلے پہیّہ کے ساتھ ملی ہوئی کلّی پر پاؤں رکھ کر سوار ہوا کرتے۔ علامہ کی وفات کے بعد وہ اکثر متین اور سنجیدہ ہی دیکھے گئے۔ انہیں اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔

یہ مردِ درویش ۸۔ مارچ ۱۸۹۴ء بروز بُدھ بوقت سحری (اُس روز رمضان کی انیسویں تاریخ تھی) موضع پہاڑنگ اونچہ، تحصیل پسرور، ضلع سیالکوٹ کے ایک جاٹ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد چودھری فضل احمد علاقہ کے ذیلداروں کے خاندان سے تھے اور اُن کو بڑی منتّوں کے بعد خداوند تعالیٰ نے لڑکا عطا کیا تھا۔ چودھری صاحب نے ۱۹۱۲ء میں ڈی بی ہائی اسکول پسرور (ضلع سیالکوٹ) سے دسویں کا امتحان پاس کیا اور اُسی سال اسلامیہ کالج لاہور میں آ داخل ہوئے۔

ان کی طبیعت کی افتادِ عربی، فارسی اور اُردو کی طرف زیادہ راغب تھی۔ زہد، تقویٰ، دینداری اور راست بازی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں ان کے پیر اُستاد مولانا محمد حسین پسروری نے ابتدا ہی سے نقشبندیہ طریق پر تربیت دی اور غالباً یہ اس تربیت کا فیض تھا کہ چودھری صاحب صوفی منش ہونے کے ساتھ ساتھ کلام اللہ، احادیث اور اصول فقہ سے خاصی رغبت رکھتے تھے اور یہ رغبت آخر عمر تک قائم رہی۔ (میں چودھری صاحب اور علامہ کی معیت میں حضرت مجدّد الف ثانی کے مزار پر سرہند حاضر ہو چکا ہوں۔ اسی دَور میں ان کی طبیعت پر ایک بزرگ "جانے شاہ" کا رنگ بھی غالب تھا۔ چھاتی تک طویل داڑھی تھی جسے جذبات پر قابو

رکھنے کی غرض سے اکثر کھجلایا کرتے۔ اس کیفیت سے متاثر ہو کر ان کے پیر اُستاد نے انہیں "جانے شاہ" کا نام دے رکھا تھا) زندگی کے ابتدائی حصّہ میں فقر کا رنگ کچھ ایسا غالب آیا کہ ہر وقت مستغرق سے رہتے۔ یہاں تک کہ ان کے والد بزرگوار کو ان کی صحت کے متعلق فکر لاحق ہو گئی۔

جن دِنوں چودھری صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے مسلمان تحریک علی گڑھ کی وجہ سے بیدار ہو چکے تھے۔ اور دنیائے اسلام کی سیاسی حالت پر نہایت فکرمند اور پریشان تھے۔ بزرگانِ دین کا دَور دورہ تھا۔ ہر طالب علم کا دل پیامِ اسلام سے معمور تھا۔ یہ ماحول چودھری صاحب کو راس آیا۔ کالج کی زندگی کے دوران میں کوئی بھی نماز اس اللہ کے بندے سے قضا نہ ہوئی۔ روزے تو آخری دم تک رکھتے رہے کم و بیش تہجد سے بھی کوتاہی نہ ہوئی۔ عشاء کی نماز کے بعد سو سو نفل وقتاً فوقتاً گزارتے تھے۔

آپ ریواز ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اور ہوسٹل کا ہر مقیم آپ کی خوش خلقی کی وجہ سے آپ سے محبت کرتا تھا۔ شعر تو آپ نے اسکول کی زندگی ہی میں کہنے شروع کر دیئے تھے۔ جوں جوں ذہن پختہ ہوا پرانے استادوں کا ادراک آپ کی فطرت کا حصّہ بنا۔ نیز زندہ دِلی بھی پیدا ہوئی جو بعد میں ضرب المثل بنی۔ اس زمانے میں اپنے آپ کو محمد حسین پہاڑنگی لکھا کرتے تھے گو تخلص کوئی بھی اختیار نہ کیا۔ آپ کی غزلیں اور نظمیں اکثر روزنامہ "الاثر" اور "زمیندار" میں شائع ہوتیں۔ اکبر الہ آبادی سے بھی خط و کتابت جاری ہوئی اور ان کے ظریفانہ رنگ کو اپنے اشعار میں اپنایا۔

ایک روز مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ جماعت ہونے کو تھی مگر ریواز ہوسٹل کے

اُس کمرہ میں جہاں نماز ادا کی جاتی تھی کوئی چراغ روشن نہ تھا (بجلی اُن دنوں ریوازہ ہوسٹل میں نہ تھی) آپ نے فرمایا ؎

روشنی مسجد میں ہونی چاہیئے

نماز کے بعد احباب میں سے کسی نے شکوہ کیا۔ "مصرع ادھورا ہے .. وضاحت کیجئے۔" تو برجستہ بولے ؎

وقتِ مغرب قبل تکبیرِ صلوٰۃ
روشنی مسجد میں ہونی چاہیئے

اسی دَور کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تا کجا در صحبتِ یاراں نشینی ز اشتیاق
اے رہین لطف صحبت آخر صحبت فراق

زندہ دلی اور تغزّل کی مثالیں بھی آپ کے اشعار میں بے شمار ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

چل چلے چلتے ہیں مسجد کو مگر یہ تو بتا
تیرے کوچے میں کوئی اے شیخ میخانہ بھی ہے

۱۹۱۹ء میں آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے (عربی) کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ طور پر منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہنری مارٹن کے کہنے پر آپ نے نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کے بچوں کی اتالیقی قبول کر لی تھی۔ اور چونکہ نواب صاحب مرحوم کا علامہ سے گہرا دوستانہ تھا اس سبب سے چودھری صاحب کو علامہ سے ملنے کا اکثر موقع ملنے لگا۔ علامہ نے آپ کی مخلص دیانتداری کو بھانپ لیا اور پھر ایسا اپنایا کہ مرتے دم تک

نہ چھوڑا۔ انہی دِنوں جب اسرارِ خودی پہلی بار شائع ہوئی تو آپ نے علامہ کو کچھ شعر لکھ کر بھیجے۔ ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔ ؎

کوئی جا کے پوچھے تو شیخ سے یہ اُسے ہی کہتا خودی نہ ہو
جو کہ بے خودی کی زباں پہ ہے میں جمالِ روئے یار ہوں!

گو اثر نہیں وہ زبان میں وہ تپش نہیں ہے اذان میں
پہ یہ للکتیں ہیں بتا رہیں کہ میں یادگارِ بلال ہوں

علامہ سے مراسم کے بعد غالباً ۱۹۲۴ء میں آپ کی ایک غزل علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کے حال پہ بے حد آزردہ خاطر معلوم ہوتے ہیں ؎

دل چاہتا ہے نت نئے فتنے سے کھیل کود
کیوں بس میں اپنے گردشِ چرخِ کہن نہیں
کب تک پھرے گا وادیٔ وحشت میں ساتھ ساتھ
تیرِ قضا ہے، خارِ سرِ پیرہن نہیں
ہستی سے دل کے گرم ہیں ہستی کی محفلیں
اس صدر انجمن کی کہیں انجمن نہیں
کیا دن تھے گلستاں پہ ہمارے بتائے کون!
غنچے نہیں، صبا نہیں، مرغِ چمن نہیں
لائے جو رنگ پر تھے کبھی رنگ روزگار!
اس آئینہ میں رُخ وہی پر تو فگن نہیں

مجنوں ہے غرقِ شرم کہ صحرا نورد تھا
سنتا بھی کیا، تھی کوہکنی کوہکن نہیں

اور آخر میں علامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ظاہر خدا کرے گا خدائے سخن کی شان
ان کافروں کو ہند کے ذوقِ سخن نہیں

لیکن چودھری صاحب نے علامہ کے کہنے پر شاعری کو ترک کر دیا اور نثر کی طرف توجہ کی۔ آپ کے مضمون کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں آپ نے علامہ کے اصرار پر پنجاب سول سیکرٹریٹ میں ملازمت کر لی۔ ایک سو ساٹھ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ تب داڑھی کچھ ترشوالی۔ دفتر میں آپ کی میز سے پرے کھونٹی پر ایک نکٹائی لٹکتی رہتی تھی۔ جب افسروں کو ملنے جاتے تو شلوار، قمیض، ہاف کوٹ اور رومی ٹوپی کے ساتھ اس نکٹائی کا اضافہ ہو جاتا۔ واپسی پر نکٹائی اتار کر پھر کھونٹی پر لٹکا دی جاتی۔ آپ کی سرتاپا مشرقی شخصیت میں صرف یہ نکٹائی ہی مغرب کی موجودگی کے احساس کی دلیل تھی۔

آپ پریس برانچ سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے ہوم ڈپارٹمنٹ تک پہنچے۔ ۱۹۳۶ء میں یعنی علامہ کی زندگی ہی میں آپ کو خانصاحب کا خطاب ملا۔ ۱۹۴۳ء میں خانصاحب سے خان بہادر بنا دیئے گئے۔ لیکن سادگی نے آپ کی بائیسکل کی طرح آخر عمر تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک مرتبہ شادی کی چھ لڑکیوں اور تین لڑکوں کے باپ بنے۔ (لڑکوں کے نام نفیس، جلیس اور ادریس علامہ ہی نے تجویز کیے تھے) خرچ کی تنگی کے باوجود بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی۔ موٹر کار خرید لی لیکن آپ سے

کہیں زیادہ اُسے اولاد نے استعمال کیا۔ شروع شروع میں تو نواب ذوالفقار علی خان مرحوم کے ساتھ رہتے تھے مگر بعد میں قلعہ گوجر سنگھ لاہور میں اپنا مکان "فضل منزل" تعمیر کرایا اور وہاں اُٹھ آئے۔

سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ انجمن حمایتِ اسلام کو بھی آپ کی خدمات کا فخر حاصل ہے۔ آپ کو علامہ ہی نے انجمن سے متعارف کرایا اور جب انجمن نے تعلیم نسواں کے لئے زنانہ کالج کھولا تو آپ اس کے آنریری سیکرٹری مقرر کئے گئے۔

علامہ کے ساتھ آپ کے مراسم کی گہرائی کا اندازہ لگانا بیحد مشکل ہے۔ یہ آپ ہی کا مشورہ تھا کہ علامہ نے اپنا کلام مجموعوں کی صورت میں شائع کرانا شروع کیا۔ جب "بانگ درا" پہلی مرتبہ چھپی تو علامہ نے ایک جلد چودھری صاحب کو تحفۃً دی۔ اس جلد کے سرورق پر علامہ کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا ایک شعر ہے جو آپ کے علامہ سے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا

چودھری صاحب بلا ناغہ رات کو علامہ کے پاس آیا کرتے جب کہ سب ملنے جلنے والے جا چکے ہوتے اور علامہ تنہا ہوتے۔ علامہ چودھری صاحب کو اپنا تازہ کلام سناتے۔ ایک پرانے لیمپ کی ماندسی روشنی میں دونوں بزرگ فارسی یا عربی لغت کی موٹی موٹی جلدوں کے صفحے اُلٹتے، اشعار میں مضمون کی یک جہتی، الفاظ کی صحت یا جذبات کی ہم آہنگی پر بحث و تمحیص ہوتی۔ بعض اوقات اسلام، فلسفہ یا سیاست پر گفتگو ہوتی یا ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ چودھری صاحب بہت کھل

کر ہنستے تھے اور آپ کے قہقہوں کی آواز اکثر علامہ کے کمرہ میں گونجا کرتی۔ آپ اچھی غذا کے نہ صرف شوقین تھے بلکہ خوب کھاتے تھے۔ جن دنوں علامہ علیل تھے اور اطباء کے مشورہ پر انہوں نے مرغن غذائیں کھانی بند کر رکھی تھیں تو علامہ اکثر بریانی، قورمہ، مُرغ مسلّم اور کباب پکواتے اور اپنے روبرو چودھری صاحب کو کھلواتے اور آپ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ چودھری صاحب کو علامہ کی طرح آموں سے بھی بڑی رغبت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں علامہ کے لئے ہندوستان بھر سے آموں کے ٹوکرے آیا کرتے اور اُن سے چودھری صاحب کی تواضع کی جاتی۔ بعض اوقات اسی قسم کی محفلیں دریائے راوی کے کنارے میاں نظام الدین مرحوم کے آموں کے باغات میں لگتیں۔ (میں بھی چند ایک ایسی محفلوں میں شریک ہو چکا ہوں) سردیوں کے موسم میں شاہِ افغانستان کی بھیجی ہوئی سَردوں، انگوروں اور خشک میووں کی پیٹیاں آیا کرتیں اور ان میووں کو کھاتے وقت گفتگو برّاعظم ہندو پاکستان کی حدوں سے نکل کر مشرق وسطیٰ میں پہنچ جاتی۔ قندھار، غزنی، کابل، طہران اور تبریز سے ان پھلوں کا ذکر علامہ اور چودھری صاحب کو سلاطین، اساتذہ اور صوفیائے کرام تک لے جاتا۔ غرضیکہ عجب سماں بندھتا۔ بات کہاں سے چلتی اور کہاں تک پہنچ جاتی۔ پھر علی بخش سے مذاق ہونے لگتا اور چودھری صاحب کبھی اس کی خضاب زدہ مونچھوں پر پھبتی کستے کبھی اُسے بیاہ کرنے کو کہتے اور کبھی اُسے سرکار سے مربعے دلوانے کی حامی بھرتے۔ غالباً۔ اس زمانے میں چودھری صاحب نے ایک نیلے رنگ کا اوورکوٹ بھی سلوایا تھا جو عرصہ تک مذاق کا موجب بنا رہا۔

۱۹۲۵-۲۶ء میں چودھری صاحب نے علامہ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی ایک

یادداشت بھی لکھنی شروع کی - اس یادداشت میں دینی ، علمی اور ادبی باتوں کے علاوہ بعض باتیں خاص دلچسپ ہیں مثلاً لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ پر ایک خاتون فریفتہ ہوگئیں - ان سے خط و کتابت کرنے لگیں - اور انہیں لکھا کہ میرے ساتھ شادی کرلو - علامہ نے کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے اپنی طرف سے کسی شخص کو علامہ سے رشتہ طے کرنے کی غرض سے بھیج دیا - جب وہ شخص آیا تو چودھری صاحب بھی وہیں موجود تھے - (یہ اُس زمانے کی بات ہے جب چودھری صاحب کے سارے احباب انہیں غیر شادی شدہ سمجھتے تھے - یہاں تک کہ نواب صاحب مرحوم اور علامہ کو بھی معلوم نہ تھا کہ چودھری صاحب شادی شدہ ہیں اور صاحبِ اولاد ہیں) علامہ نے اُس شخص کو بیٹھنے کے لئے کہا اور آنے کی وجہ پوچھی - اس وقت چودھری صاحب دُور کھڑے کتابوں کی الماری میں کسی کتاب کی تلاش کر رہے تھے - وہ شخص کہنے لگا - " میں ڈاکٹر اقبال سے ملنا چاہتا ہوں - مہربانی کرکے مجھے بتایئے کہ آپ دونوں میں وہ کون سے ہیں ؟ " علامہ نے کہہ دیا کہ میں ڈاکٹر اقبال ہوں - اس کے بعد اس شخص نے بتایا کہ وہ ان کے رشتہ کی غرض سے آیا ہے - علامہ نے معذرت کی کہ وہ شادی شدہ ہیں اور انہیں مزید شادی کی فی الحال ضرورت نہیں - جب وہ شخص جا چکا تو علامہ نے سارا قصہ چودھری صاحب کو کہہ سنایا - چودھری صاحب بولے - " واہ ، آپ کو چاہیئے تھا کہ میری طرف اشارہ کرکے کہہ دیتے کہ ڈاکٹر اقبال میں ہوں - اگر آپ کو خود شادی نہ کرنی تھی تو کم از کم میرا بندوبست تو ہو جاتا - "

کلامِ اقبال کا ایک ایک شعر چودھری صاحب کے ہاتھوں سے گزرا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا - کہ آپ کو علامہ کے ہر شعر کی شانِ نزول کے متعلق آگاہی ہی نہ تھی

بلکہ ہر اشارے کو بھی سمجھتے تھے - مثلاً ایک مرتبہ فرمایا کہ علامہ کے مندرجہ ذیل شعر

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

میں "درویشی" سے مراد مہاتما گاندھی کی درویشی ہے اور "سلطانی" سے مراد متحدہ پنجاب کی برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی ہے (یعنی یونینسٹ پارٹی جس کے قائد ان دنوں سر سکندر حیات خاں تھے)

آپ علامہ کے ساتھ جنوبی ہندوستان کے دورے پر بھی گئے - جب علامہ نے مدراس میں اسلام پر اپنے مشہور و معروف لکچر دئے (جن کا مجموعہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے) تو چودھری صاحب ان کی معیت میں تھے - جب علامہ سلطان ٹیپو رح کے مزار کی زیارت کی غرض سے میسور گئے تو چودھری صاحب ان کی معیت میں تھے - ۱۹۳۵ء میں علامہ کو متعدد عارضے لاحق ہوئے اور زندگی کی کوئی اُمید نہ رہی - تب انہوں نے چودھری صاحب کو میرا اور منیرہ کا ولی مقرر کیا آپ کو ایک چٹھی لفافہ بند کر کے دی اور فرمایا یہ لفافہ میری موت کے بعد کھولا جائے -

مجھے علامہ کی آخری رات خوب یاد ہے - ان کی چارپائی گول کمرے میں بچھی تھی اور احباب جمع تھے میں کوئی نو بجے کے قریب اُس کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے ان دنوں ان کی نظر بے حد کمزور ہو چکی تھی - پوچھا - "کون ہے ؟" میں نے جواب دیا - "میں جاوید ہوں ابا جان !" ہنس کر بولے - "جاوید بن کر دکھاؤ - بن کر -" پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے چودھری صاحب سے مخاطب ہوئے - "اسے جاوید نامہ کے آخیر میں وہ دُعائیہ خطاب بہ جاوید" ضرور پڑھوا دیجئے گا -"

چودھری صاحب نے انبساط سے سر ہلا دیا گویا کہہ رہے ہیں۔ "آپ بے فکر رہیئے۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق عمل میں لایا جائے گا۔"

اور خدا گواہ ہے سب کچھ علامہ کی مرضی کے مطابق عمل میں لایا گیا۔ علامہ نے ۲۱ اپریل کی صبح کو پانچ بجے کے قریب داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مجھے آج تک چودھری صاحب کا متین اور سنجیدہ چہرہ یاد ہے۔ اس روز آپ کی نگاہوں میں آنسو نہیں تھے۔ گویا علامہ کا انتقال ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے کیونکہ آپ خود بھی ایک روز اسی طرح انتقال کریں گے اور علامہ سے ایک بار پھر ملاقات ہوگی۔ علامہ کی تجہیز و تکفین اور ان کی لحد کے لئے مناسب جگہ کے انتظام کے سلسلہ میں جو تردد کرنا پڑا چودھری صاحب اس میں پیش پیش تھے۔

علامہ کی وفات کے بعد چودھری صاحب میں جو چند تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ جیسے کہ میں ذکر کر چکا ہوں آپ کے مانوس قہقہے پھر نہ سُنے گئے۔ آپ بمطابق معمول ہر شام "جاوید منزل" میرا اور منیرہ کا حال پُوچھنے آتے۔ علی بخش سے آرام کرسی منگوا کر عموماً باہر دالان یا برآمدے میں بیٹھتے۔ رومی ٹوپی اتار کر فرش پر رکھ دیتے اور دوران گفتگو میں سر پہ ہاتھ پھیرتے جاتے۔ آپ کی بائیسکل قریب ہی کھڑی ہوتی۔ علامہ کی وفات کے بعد آپ نے ہمارے اصرار کے باوجود نہ تو اس گھر میں کبھی کچھ کھایا اور نہ پیا۔ گرمیوں کی جھلستی ہوئی دوپہر میں اگر تشریف لاتے اور میں یا منیرہ آپ کو شربت کا گلاس پلوانے پر مصر ہوتے تو صاف انکار کر دیا کرتے اور سادہ پانی ہی پیتے۔ اس طرح منیرہ کی شادی کے بعد اگر آپ اُسے ملنے کی غرض سے بھی اس کی سسرال جاتے تو وہاں بھی نہ کچھ کھاتے اور نہ ہی پیتے۔ اس معاملہ میں آپ کی وضع داری کئی بار ہماری ناراضگی کا موجب بھی بنتی۔

لیکن آپ ہنس کر ہمیں منا لیا کرتے۔

آپ اب ہر اس شخص پر شُبہ کرنے لگے تھے جو علامہ پر کچھ تحریر کرنے کا خواہشمند ہوتا۔ آپ کو یقین تھا کہ علامہ پر صدق دِلی سے کچھ لکھنے والے بہت کم ہیں لیکن ان کے نام پر روپیہ بنانے والے بے شمار ہیں۔ اسی بنا پر جب بھی کوئی اس سلسلہ میں آپ سے کسی قسم کی قانونی اجازت طلب کرنے آتا تو اُسے ٹال دیتے یا اگر اجازت دیتے تو ہمیشہ ہمارے مالی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر اجازت دیتے، آپ کو علامہ کے سب احباب کے متعلق علامہ کی ذاتی رائے معلوم تھی، اور آپ مجھے اپنی زندگی ہی میں قریب قریب علامہ کے ہر ملنے جلنے والے کے متعلق کچھ نہ کچھ بتا گئے۔ چودھری صاحب کی علامہ کے کلام کے بارے میں اس پابندی کی وجہ سے اکثر لوگ آپ سے نالاں تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو بعض لوگوں نے گمنام محفلوں میں گالیاں بھی دیں یا ٹیلی فون پر آپ سے کہا تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ تم اقبال کے خزانہ پر سانپ کی طرح بیٹھے ہو؟ لیکن ان سب باتوں کے باوجود چودھری صاحب نے اپنا رویہ نہ بدلا،

میں نے آپ سے کئی بار کہا کہ اگر آپ اوروں کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ علامہ پر کچھ تحریر کریں تو آپ خود علامہ پر ایک کتاب لکھ ڈالئے لیکن آپ ہر مرتبہ یہی کہہ کر مجھے خاموش کر دیتے کہ میرے نزدیک علامہ کے نام پر روپیہ بنانا حرام ہے۔ اگر میں یوں کروں تو علامہ سے ملاقات کے وقت مجھے شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔ البتہ جب تم علامہ پر کوئی کتاب لکھنے کے قابل ہو جاؤ گے تو انشاء اللہ جو کچھ بھی ان کی ذات کے متعلق جانتا ہوں یا جو کچھ میں نے ان کے کلام سے سمجھا ہے تمہیں بتا دوں گا۔

ایک مرتبہ میں نے چودھری صاحب سے کہا کہ میرا ارادہ آپ کی ذات پر ایک

مضمون لکھنے کا ہے تو بہت شرمائے ۔ بولے "کیا تم دنیا سے یہ کہلوانا چاہتے ہو کہ میں اپنی شہرت کی خاطر اقبال کی اولاد سے اپنی مدح سرائی کرا رہا ہوں ؟" اس کے بعد مجھے منع کر دیا۔ آج اگر آپ ہوتے تو مجھے اپنے آپ پر مضمون لکھنے کی اجازت قطعی نہ دیتے۔

چودھری صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ علامہ کے کلام کے متن کو صاف رکھا جائے اور اپنی زندگی میں اس کام کو انجام دینے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ علامہ کی وفات کے بعد ان کے کلام کا ہر مجموعہ آپ کی زیرِ نگرانی شائع ہوا۔

آپ علامہ کی وفات کے بعد مزار کمیٹی اور سنٹرل اقبال کمیٹی کے پریذیڈنٹ بھی منتخب ہوئے ۔ علامہ کے مزار کے متعلق آپ کی تمنا یہی تھی کہ وہ قوم کے چندہ سے تعمیر ہو۔ لیکن اس قوم کے اکثر امراء اسی صورت میں چندہ دینے کو تیار تھے کہ ان کے ناموں کا کتبہ علامہ کے مزار پر نصب کیا جائے اس قسم کے لوگوں سے چندہ قبول نہ کیا گیا۔

علامہ کے مزار کے نقشہ کے متعلق بھی کئی بار چودھری صاحب سے باتیں ہوئیں۔ فن تعمیر، ادب اور فنون لطیفہ کے متعلق آپ کا نظریہ کلاسیکی تھا۔ آپ مغل آرٹ کو تنزل شدہ تصور کرتے تھے کیونکہ اس کی نازک نازک لکیروں سے نسوانیت ٹپکتی ہے۔ اسی طرح وہ عمارات جن کے طرزِ تعمیر سے شوکت و جلال کی بجائے نفاست یا نازک پن کا اظہار ہوتا۔ آپ کو ناپسند تھیں۔ آپ کی نگاہ میں انسانی تخلیق جتنی دیر جمال کے ساتھ ساتھ شوکت و جلال کے جذبات نہ اُکسائے تنزل شدہ تھی۔ اسی نظریہ کے پیشِ نظر علامہ کے مزار کی تعمیر کے لئے نقشہ منتخب کرنے کے سلسلہ میں آپ کو خاصی محنت کرنی پڑی اور جو نقشہ بالآخر منظور ہوا۔ اس میں خیال رکھا گیا کہ سادہ ہونے

کے ساتھ ساتھ علامہ کا مزار پُر شکوہ دکھائی دے۔

جن دنوں علامہ کا مزار زیرِ تعمیر تھا میں کئی بار چودھری صاحب کے ساتھ مزار پر گیا۔ آپ مجھے پتھروں کے نام بتاتے قسمیں گنواتے اور ساتھ یہ بھی بتاتے کہ مشاہیرِ اسلام کے مزاروں کی تعمیر کس نوعیت کی ہے اُن دنوں آپ علامہ کے مزار کے اندر چھت پر کندہ کروانے کے لئے اشعار منتخب کر رہے تھے علاوہ اس کے آپ طرزِ خط سے متعلق معلومات بھی رکھتے تھے۔ تمدّنِ اسلامی نے اس سلسلہ میں جو جو مختلف طرزیں اختراع کیں آپ کو معلوم تھیں۔ کوفی طرزِ خط سے خاص رغبت تھی۔ جب قلعہ لاہور کے عظیم الشان دروازے سے اس طرف شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے کبھی آپ سے اس قسم کی گفتگو چھڑ جاتی تو میں اکثر محسوس کیا کرتا کہ ہم قرونِ وسطیٰ کے کسی عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ تمدّنِ اسلامی زندہ ہے اور اس کے زوال کے آثار ابھی پیدا نہیں ہوئے۔

چودھری صاحب کی نظر میں دنیائے اسلام علامہ سے عظیم تر شخصیت پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ علامہ کی وفات کے بعد کا لٹریچر پڑھنا تو درکنار آپ اسے دیکھنے تک کے روادار نہ تھے۔ ایک بار آپ کے صاحبزادے نفیس نے آپ سے پوچھا کہ قرآن مجید کی سورۃ الشعراء میں اور حدیث میں شعرا کی مذمت اور تذلیل کی گئی ہے۔ آپ علامہ کو کس زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ جواب دیا "سورۃ الشعراء کو بغور پڑھو شاعروں کی تذلیل واقعی کی گئی ہے مگر سوائے اُن شاعروں کے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ الا الذین امنوا و عملوا الصلحت و ذکروا اللہ کثیرا وانتصروا من بعد ما ظلموا، میں علامہ کو بحیثیت شاعر اس زمرے میں

شامل کرتا ہوں۔"

۱۹۴۳ء میں چودھری صاحب نے مجھے دیوانِ غالب پڑھانا شروع کیا۔ آپ غالب کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔ آپ کے خیال میں غالب ایک ایسے زمانہ میں زندہ تھا جب کہ سیاسی طور پر ہندوستان میں اسلام کا زوال آ رہا تھا اور آپ اس لئے غالب کو قابلِ معافی نہ سمجھتے تھے کہ اس نے اسلام کی سربلندی کے لئے انگشت تک نہ ہلائی۔ گردشِ حالات نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا لیکن غالب پیغامِ عمل کی تلقین کرنے کی بجائے "بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں" کہتا ہی مر گیا۔ اس کے سارے کلام میں صرف ایک شعر ہندی اسلام کے دورِ تنزل کی عکاسی کرتا ہے جو بہادر شاہ ظفر کے متعلق ہے۔ ؎

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

بہرحال آپ دیوانِ غالب پڑھاتے وقت غالب کے اندازِ تغزل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ بعض اوقات تو ایک ایک شعر پر گھنٹوں لگا دیتے اور آپ کو یہ خیال ہی نہ رہتا کہ میں موجود ہوں۔ غالب کے اشعار کی تشریح کرتے کرتے کسی اور ہی طرف نکل جاتے جب دیوان غالب ختم ہوا تو آپ نے مجھے کلام اقبال پڑھانا شروع کیا۔ جس شوق سے آپ نے کلام اقبال پڑھایا اس کے متعلق تحریر کرنا ممکن نہیں۔ آپ نے مجھے علامہ کے فرمان کے مطابق جاوید نامہ کے آ میں "خطاب بہ جاوید" بھی پڑھایا۔ وہ میرے لئے ایک بہت بڑا دن تھا لیکن چودھری صاحب کے پُرسکون چہرے پر جذبات کا قطعی ہیجان نہ تھا۔ گویا آپ سے میرا "خطاب بہ جاوید" پڑھنا ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ ان دنوں میں ایم اے انگریزی میں پڑھتا تھا لیکن چودھری صاحب کی گفتگو اور کلام اقبال کے اثر نے مجھ میں فلسفہ پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ ۱۹۴۶ء میں میں نے

ایم اے کر چکنے کے بعد ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ تب ہماری محفلیں بے حد دلچسپ ہو گئیں ۔ چودھری صاحب ان دنوں خود بھی مولانا غلام رسول خاں سے اصول فقہ پر سبق لینے لاہوری دروازہ کے اندر کسی مسجد میں جایا کرتے تھے۔ آپ نے عربی منطق پر عبور حاصل کیا اور ہماری خوب خوب بحثیں ہوتیں۔

چودھری صاحب میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ اگر میں زندگی کے کسی مرحلے پر کسی قسم کی کوئی بھی کامیابی حاصل کرتا تو مجھے کبھی شاباش نہ دیتے بلکہ اُس بات کا ذکر تک نہ کرتے۔ مثلاً جب میں ایم اے فلسفہ میں یونیورسٹی بھر میں اول رہا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا تو آپ اس شام ملنے آئے لیکن جاننے کے باوجود اس بات کا ذکر نہ کیا۔ میں بھی خاموش رہا۔ آپ کی نظر میں ہر وہ کامیابی جو میں نے اپنی محنت سے حاصل کی گویا ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ کامیابی کے لئے تگ و دو درست ہے۔ مگر اس کا حصول مقامِ مسرت نہیں بلکہ اس وقت انسان کو اگلی منزل کے لئے فکر کرنی چاہیئے اور تگ و دو کے نئے سلسلہ کے لئے ایک بار پھر کمربستہ ہونا چاہیئے۔

چودھری صاحب کو کامل یقین تھا کہ آپ علامہ سے ملیں گے آپ بات بات پر اس ملاقات کا ذکر یوں کرتے جیسے فوت نہیں ہوئے بلکہ زندہ ہیں صرف کہیں اور چلے گئے ہیں جہاں ہم سب ایک نہ ایک روز جائیں گے۔ مجھ سے اکثر کہا کرتے "تم بے شک پھڑ پھڑاؤ، اڑو، تیرو، جس طرف چاہے نکل جاؤ لیکن تمہیں گرنا اُسی مقام پر ہے جو تمہارے لئے متعین ہے۔"

اس زمانے میں میں نے لکھنا لکھانا شروع کر رکھا تھا۔ میرے افسانے، ڈرامے

اور مضمون اکثر ترقی پسند رسالوں میں شائع ہوتے بعض اوقات میں اپنے ڈرامے چودھری صاحب کو پڑھ کر بھی سنایا کرتا لیکن ہمیشہ اصرار کرتے کہ کسی نصب العین کا تعین کرو۔ اگر نصب العین کوئی نہیں تو لکھنا بیکار ہے۔ اُن دنوں ترقی پسندی خاصے زوروں پر تھی اور ترقی پسند انشا پردازوں کے سیاسی نقطۂ نگاہ سے حکومت کو اختلاف تھا۔ بیشتر ترقی پسند ادیب کمیونزم کے حامی تھے۔ اور رفتہ رفتہ نئی پود کو اپنے سیاسی دائرے میں کھینچ رہے تھے۔ اکثر نوجوان اس تحریک کے ادبی پہلو سے متاثر ہوئے اور کمیونزم کی لپیٹ میں آ گئے۔ لیکن چونکہ کمیونزم میری سمجھ سے بالاتر تھا اس لئے میں ترقی پسندی کے صرف ادبی پہلو ہی سے متاثر ہوا۔ چودھری صاحب اُن دنوں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور پریس کے معاملات میں حکومت پنجاب کے مشیر خاص بھی تھے۔ رسالوں کی اشاعت کے اجازت نامے دینا یا انہیں ضبط کرنا آپ ہی کے اختیار میں تھا۔ آپ نے فحش نگاری یا عریانیت کی بنا پر متعدد ترقی پسند رسالے ضبط کروائے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو سوال پیدا ہوا کہ نئے حالات کے پیشِ نظر ادیبوں کے فرائض کیا ہونے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک مرتبہ چند مشہور و معروف ترقی پسند ادیبوں کو اپنے یہاں بلوایا اور چودھری صاحب سے انہیں ملوایا تاکہ چودھری صاحب قومی ضروریات کے پیشِ نظر ہمیں یہ بتائیں کہ اس وقت کس قسم کے ادب کی ضرورت ہے۔ چودھری صاحب کافی دیر تک ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے آپ کی باتوں کا اثر ترقی پسند ادیبوں پر تو کیا ہونا تھا۔ البتہ مجھ پر اثر ضرور ہوا۔ میں نے ترقی پسندوں کے گروہ سے اپنے آپ کو منقطع کر لیا اور اس سلسلہ میں کچھ مضمون بھی "نصب العین کا مسئلہ" کے زیرِ عنوان شائع کرائے۔

سعادت حسن منٹو چودھری صاحب سے بہت نالاں تھا چونکہ آپ ہر وہ رسالہ ضبط کرواتے تھے جس میں منٹو کا کوئی افسانہ شائع ہوتا تھا۔ یوں آپ کی شہرت یا بدنامی کا باعث بنتے تھے۔ منٹو نے اپنے فحش افسانوں کے ایک مجموعہ کا انتساب چودھری صاحب کے نام کیا ہے اور نیچے علامہ کا یہ شعر لکھا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جس شخص کے متعلق علامہ نے تو مندرجہ ذیل خیال کا اظہار فرمایا

؎ بروں کشید ز پیچاک ہست و بود مرا
چہ عقدہ کہ مقام رضا کشود مرا!

ترقی پسندوں نے انہیں "مردِ ناداں" کا خطاب دے کر اپنی دانائی اور دانشوری کا ثبوت دیا۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں منیرہ کی شادی ہوئی اور چودھری صاحب اپنے ایک اہم فرض سے سبکدوش ہوئے۔ اس روز میں نے آپ کو بڑے عرصہ کے بعد ہشاش بشاش دیکھا۔ چھ ماہ بعد یعنی ستمبر ۱۹۴۹ء میں میں انگلستان روانہ ہوا۔ آپ مجھے خیر باد کہنے کے لئے لاہور اسٹیشن پر موجود تھے۔ یہ آخری بار تھی جب میں نے آپ کو دیکھا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو فرمایا "علم شکار کرنا، علم" یہ آپ کے آخری الفاظ تھے جو میرے کانوں میں گونجے۔ گاڑی چل دی اور میں اس خیال سے سر باہر نکالے دیکھتا رہا کہ شاید ایک بار پھر نظریں چار ہوں مگر انہوں نے مڑ کر میری طرف نہ دیکھا۔

انگلستان سے میں نے اپنے تاثرات چند خطوں میں آپ کو تحریر کئے نیز کیمبرج

پہنچ کر ڈاکٹریٹ کے لئے موضوع کے تعین کے سلسلہ میں بھی آپ کا مشورہ طلب کیا۔ اُن دنوں انگلستان میں میرا دل نہ لگتا تھا اور میں گھر کے لئے بے حد اداس رہتا تھا چودھری صاحب نے میرے کسی بھی خط کا جواب نہ دیا شاید اس خیال سے کہ اپنی ذاتی مشکلات پر اگر خود قابو پاؤں گا تو مجھ میں خود اعتمادی آئے گی۔

مجھے کیمرج میں اپنا تحقیق کا کام شروع کئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ایک روز اچانک نفیس (چودھری صاحب کے بڑے صاحبزادے) کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ چودھری صاحب ۱۶ر جولائی ۱۹۵۰ء چار بجے شام میو ہسپتال کے فیملی وارڈ کے کمرہ ۱۶ میں وفات پا گئے۔ خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ اب میں تنہا ہوں اب میرے لئے سوائے میری ذات کے اور کوئی فکر کرنے والا نہیں رہا۔

چودھری صاحب کو میرے انگلستان جانے سے پیشتر ہی یہ احساس ہو چکا تھا کہ اب آپ زیادہ دیر زندہ نہ رہیں گے یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ علامہ کے بتائے ہوئے فرائض انجام دینے کی غرض سے محض قوتِ ارادی کے زور پر ہی جی رہے ہیں۔ آپ ہر وقت یہی کہتے رہتے "ابھی یہ باقی ہے، ابھی وہ باقی ہے۔" آپ نے علامہ کے کلام اور ان کی اولاد سے متعلق تمام فرائض انجام دئے۔ یہاں تک کہ وفات سے پیشتر علامہ کے مزار کی تکمیل بھی کروا گئے اور اس دوران میں یہ نہ سوچا کہ آپ اپنے ذاتی فرائض نامکمل چھوڑے جا رہے ہیں۔

علامہ کی ذات سے چودھری صاحب کی وابستگی عشق کی ایک ایسی مثال ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ مجھے یقین ہے جب آپ علامہ سے دوبارہ ملے ہوں گے تو آپ نے

علامہ کو اپنا ممنون نہ ہونے دیا ہوگا۔ گویا اُن کے بتائے ہوئے فرائض کو انجام دینا چودھری صاحب کے لئے ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔

سات سال بعد یعنی ستمبر ۵۶ء میں جب میں انگلستان سے واپس لاہور پہنچا۔ تو عزیز و اقارب، دوست احباب سب اسٹیشن پر موجود تھے دل میں ایک خلش سی تھی۔ میں نے چودھری صاحب کے صاحبزادوں کو مجھے اُن کی تربت پر لے جانے کے لئے کہا۔ ہم میاں امیرالدین صاحب کے ہمراہ اسٹیشن سے اقبال پارک کی طرف روانہ ہو گئے رات کی سیاہی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور ہم سب گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا کیونکہ مجھے ایک بار پھر اس خوف نے آ لیا تھا جس کی موجودگی کا احساس کئی بار مجھے کیمبرج اور لندن کی سرد اور تاریک راتوں کی تنہائی میں ہو چکا میں رہ رہ کر سوچتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اب میرا کیا بنے گا۔ میرے نظریات اور میرے عقائد کی تصحیح اب کیونکر ممکن ہو گی۔ خود اعتمادی تو وقت نے سکھا دی لیکن بغیر کسی رہبری کے خود شناس کیونکر بنوں گا۔

اسی عالم میں ہم اقبال پارک پہنچ گئے اور چودھری صاحب کی لحد کی طرف پیدل چلنے لگے۔ چودھری صاحب کے تینوں صاحبزادے میرے آگے آگے تھے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا۔ صاحبزادے ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئے مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اس لئے میں نے نفیس سے پوچھا "کہاں ہیں چودھری صاحب؟" وہ بولا "یہ، یہ ہے" میں نے تاریکی میں فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ لیکن فاتحہ پوری نہ ہو ئی۔ تاریکی نے مجھے رُلایا۔ بہت رُلایا۔

واپسی پر میاں امیرالدین صاحب کہنے لگے۔ چلو، یہاں تک آئے ہو تو علامہ کے

مزار پر بھی ہوتے چلو۔ مزار کی تکمیل وہ آخری کام تھا جو چودھری صاحب نے انجام دیا۔"
لیکن میرے لئے تو چودھری صاحب کی لحد پر حاضر ہونا ہی علامہ کے مزار کی زیارت کے برابر تھا۔ مگر چلتے چلتے معاً مجھے محسوس ہوا جیسے رات کی خاموش تاریکی میں چودھری صاحب میرے ساتھ آملے ہیں اور مجھے مزار اقبال کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ گویا انہیں میرے احساسِ زیاں کی پروا نہیں ہے گویا اُن کا انتقال تو ایک فطری امر تھا جسے اتنی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ زندہ لوگوں کے انجام دینے کے لئے بہت سے ایسے اہم فرائض ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور جو لوگ اہم فرائض انجام دیتے ہیں بھلا وہ کب مرتے ہیں۔ کیا اقبال مرچکا ہے ؟ کیا محمد حسین مرچکا ہے ؟"

چٹان ۲۲-۴-۵۷

علامّہ اقبال سے میری پہلی مُلاقات

میں لاہور کے ایک مدرسے میں ابھی ابجد خوان تھا کہ اقبال کا نام کانوں میں پڑنے لگا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں دور دور سے واعظ اور شاعر، خطیب، شاعر، اور لیڈر جمع ہوتے تھے۔ مولانا نذیر احمد جیسے ادیب اور خطیب اور مولانا حالی جیسے شاعر وہاں قوم کو رُلاتے، شرماتے اور گرماتے تھے۔ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ وہ اس وقت نوجوان ہوں گے لیکن ہم اپنی کم عمری کی وجہ سے پچیس برس کے شخص کو بھی بزرگ سمجھتے تھے۔ اقبال وہاں بڑی بڑی طویل دس دس بارہ بارہ بندوں کی نظمیں ایک خاص لَے میں پڑھتے تھے جو بڑی پُرسوز اور دردانگیز ہوتی تھیں۔ اقبال کی شاعری کا سکّہ سب سے پہلے یہیں پر بیٹھا اور چند سال میں سب کو محسوس ہونے لگا کہ ایک نیا ستارہ شاعری کے افق پر ابھرا ہے۔ جس کے اندر یہ ممکنات معلوم ہوتے ہیں کہ وہ آگے چل کر مہتاب و آفتاب بن جائے۔ اسی زمانے میں

اور غالباً حمایتِ اسلام کے ایک جلسے ہی میں علامہ شبلی نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ جب حالی اور آزاد کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔ اس زمانے میں ان سے میری ذاتی ملاقات بعید از قیاس بات تھی۔ ولایت جانے سے قبل اور واپسی کے کئی سال بعد تک اقبال انجمن حمایتِ اسلام میں نظمیں سناتے رہے۔ میں نے پورا شکوہ اور شمع و شاعر، ان ہی جلسوں میں ان کی زبان فیض ترجمان سے سنا ہے اور "شکوہ" بغیر لے کے بڑے پُرجوش اور مؤثر انداز میں، لوگ ان کی لے کے دلدادہ تھے، شور مچانا شروع کیا کہ لے سے پڑھئے۔ انہوں نے کہا کہ لے سے پڑھنے کی نظم نہیں ہے اس پر ایک بذوق وکیل بولے کہ اگر لے سے پڑھیں تو میں ایک کثیر رقم انجمن کو چندے میں دوں گا۔ اس پر اقبال کو غصہ آگیا اور اس شخص کو ڈانٹ دیا کہ تم کو نہیں معلوم کس قسم کے اشعار لے سے پڑھنے چاہئیں۔ اور کس قسم کے۔ سادہ اور مؤثر طریقے سے، موسیقی ہر کلام کے لئے موزوں نہیں ہوتی یہ دور گذر گیا۔ اقبال ولایت سے واپسی پر بیرسٹری کرتے تھے شاعری کم کرتے تھے، لیکن لوگ ان کی شاعری کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار ان کی کوئی نظم شائع ہوتی تھی تو اربابِ ذوق کو محسوس ہوتا تھا کہ ایک بڑی نعمت آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ ابھی تک اقبال کو پوری طرح یہ احساس نہیں تھا کہ میں شاعری سے کیا عظیم الشان کام لے سکتا ہوں۔ اور شاید کسی قدر اس خیال کا اثر باقی تھا جو انہوں نے یورپ کے قیام کے دوران میں اپنے رفیق عبدالقادر کے سامنے ظاہر کیا تھا کہ شاعری کے ذوق نے ہماری قوم میں سے جوشِ عمل کو زائل کر دیا ہے، اس لئے ارادہ ہے کہ شاعری ترک کر دوں۔

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اقبال کے بیرسٹر بننے کی کوشش میں ایک بڑا افسوسناک حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس فن سے ان کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن انہوں نے یہ پیشہ دو وجوہ سے اختیار کیا تھا۔ ایک تو پیٹ پالنے کے لئے اور دوسرے اس لئے کہ اس میں ملازمت کے مقابلے میں انسان زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ آزاد ان معنوں میں کہ وکیل حکومت کا ملازم نہیں ہوتا اور مقدمہ لینا یا نہ لینا بھی اپنے اختیار کی بات ہے۔ لیکن غمِ روزگار ہمارے ملک میں اہل کمال کو پوری طرح آزاد نہیں ہونے دیتا۔ علامہ خود ہی فرماتے ہیں۔

وہ چیز نام ہے دنیا میں جس کا آزادی
سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

میں نے ایک روز عرض کیا: ڈاکٹر صاحب! یہ وکالت کا پیشہ دنیاداری کا نچوڑ ہے۔ حرص، ہوس، بغض، ظلم، جھوٹ، بہتان۔ عدالتوں کی فضا اس تمام شیطنت سے لبریز ہوتی ہے، اس میں انسانوں کے ادنیٰ ترین جذبات کی نفسا نفسی اور افراتفری ہوتی ہے، آپ جیسے جذبات اور افکار کے انسان کے لئے تو یہ پیشہ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہو سکتا۔ فرمانے لگے کہ نہیں اس میں سے ایک بڑا فائدہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی ان خباثتوں کو عریاں دیکھ کر طبیعت میں بڑا ردعمل پیدا ہوتا ہے اور اس کثافت سے گھبرا کر روح بے تابی سے لطافت کی طرف گریز کرتی ہے مجھے خیال ہوا کہ علامہ محض طبیعت کی تسکین کے لئے جواز نکال رہے ہیں۔ وہ دل و دماغ جو اعلیٰ ترین جذبات اور افکار کی آفرینش کا اہل تھا وہ اس جھگڑے میں الجھا رہتا تھا کہ زید اور عمرو دو حریفوں میں سے ایک حریف کو حق بجانب ثابت کیا جائے۔ جن کے آپ وکیل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ فضول اور بے بنیاد مقدمے نہیں لیتے تھے۔ ان کو روپے کی ضرورت ضرور تھی لیکن اس

کی بے جا ہوس نہیں تھی ۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک مؤکل اصرار کر رہا ہے کہ آپ میرا مقدمہ لے لیں اور معقول نقد معاوضہ محنت بھی پیش کر رہا ہے لیکن وہ اس کو سمجھاتے جاتے ہیں کہ دیکھو بھائی تمہارے مقدمے میں کچھ جان نہیں ہے خواہ مخواہ اپنا روپیہ ضائع مت کرو اور موکل مصر ہے کہ آپ کو کیا، جیتنا ہارنا میری قسمت کا معاملہ ہے اجرت لیجئے اور میری طرف سے پیش ہو جایئے ۔ لیکن اقبال کو وہ آمادہ نہ کر سکا اور ناراض ہو کر واپس ہو گیا ۔ ان کی اس وکالت کی زندگی کا ایک واقعہ مجھے یاد آگیا جو ایک سبق آموز لطیفہ ہے ایک مولوی صاحب ان کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور کچھ دینیات اور فقہ کے مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور کچھ اپنے ورثۂ پدری کے جھگڑے کے متعلق وہ اپنے والد مرحوم کے ترکے سے اپنی بہن کو حصہ شرعی دینا نہیں چاہتے تھے اور انگریزی قانون کا سہارا ڈھونڈتے تھے پنجاب میں دینداری کے بڑے بڑے مدعی صوم و صلوٰۃ کے پابند لوگ ورثے کے معاملے میں عدالت میں علی الاعلان کھڑے ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری برادری یا ہمارے علاقے میں ورثہ شرع محمدی کے مطابق تقسیم نہیں ہوتا بلکہ رواج کے مطابق ہوتا ہے اور رواج لڑکیوں کو ورثے میں حصہ نہیں دلاتا ۔ اس بارے میں شہادتیں پیش کی جاتی ہیں اور عدالت رواج کے مطابق رواج کے ثابت ہونے پر فیصلہ کر دیتی ہے ۔ یہ مولوی صاحب اقبال کو ہمیشہ طعنہ دیتے تھے کہ تم اس قدر علم دین رکھنے کے باوجود اور اسلام اور اس کے نبیؐ سے اس قدر عشق کا دعویٰ کرنے پر بھی ڈاڑھی کیوں نہیں رکھتے ۔ آخر ایک روز تنگ آکر اقبال نے کہا کہ دیکھئے مولوی صاحب علم اور ایمان کے باوجود ہر شخص کے عمل میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے آپ کی کمزوری اور خلاف شرع حرکت یہ ہے کہ آپ بہن کو حصہ نہیں دیتے اور میری کوتاہی یہ ہے کہ میں ڈاڑھی منڈاتا ہوں، لایئے ہاتھ بڑھایئے اس

وقت ایک معاہدہ ہو جائے جس سے آپ کی اور میری کمزوریاں رفع ہو جائیں۔ آپ بہن کو ورثے میں حصہ دے دیجئے اور میں ڈاڑھی بڑھائے لیتا ہوں۔ لیکن مولوی صاحب کو ہمت نہ ہوئی۔

اقبال وکالت میں کچھ زیادہ وقت صرف نہیں کرتے تھے، اس کو محض پیٹ پالنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ صرف ہائی کورٹ میں اپیل کے مقدمے لیتے تھے جن میں دردِ سری کم ہوتی ہے اور علم و عقل اور نکتہ بینی سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ مقدمے بھی بہت چُن کر تھوڑی تعداد میں لیتے تھے۔ اس وجہ سے میرا خیال ہے کہ ان کی وکالت کی آمدنی کبھی ایک ہزار ماہوار سے زیادہ نہ ہوئی۔ وہ طبعاً شاعر اور علم دوست تھے، لیکن میں نے ایک بات ان کی زندگی میں ایسی دیکھی جو مشاہیر میں سے شاید ہی کسی کی زندگی میں ملے۔ ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور ہر شخص ان کے پاس ہر وقت بے تکلف چلا آتا تھا۔ ان کے گھر اور ان کی صحبت پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

شاعری کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز بہت تھے۔ نہ صرف طالب علموں اور علم دوست لوگوں کو ان سے ملنے کی آرزو رہتی تھی بلکہ ایسے لوگوں کو بھی جو ان کو بڑا شاعر اور صاحبِ کمال سمجھ کر ان سے ملاقات کو ایک نعمت سمجھتے ان کے پاس مختلف امتحانوں کے پرچے آتے تھے۔ سال کے بعض مہینوں میں جب بھی ان سے ملا تو دیکھا کہ مہمل جوابات کی ورق گردانی ہو رہی ہے۔ مجھے ان کے اس مشغلے پر اس وقت افسوس نہیں ہوتا تھا جتنا اب ہوتا ہے کہ غم روزگار اور زندگی کی مجبوریوں نے اس یگانۂ عصر کے قیمتی

اوقات اور قوتوں کو کن کاموں میں لگا رکھا تھا۔ اس جوہر ناشناس تمدّن کو کیا کہیئے جو ایک غیر معمولی صاحب کمال کو بھی معمولی سادہ زندگی بسر کرنے کے لئے غمِ روزگار سے بے نیاز نہ کر سکے۔ اسی وقت اور اسی محنت کو اگر وہ کسی علمی کام یا شاعری میں صرف کر سکتے تو لاتعداد انسان اس سے مستفید اور لطف اندوز ہوتے اس زمانے میں ابھی اُردو نثر و نظم لکھنے والے صاحب کمال ہونے پر بھی معقول معاوضہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ اقبال نے مجھ سے فرمایا کہ اگر ہماری قوم میں اہلِ قلم اچھا روزگار پیدا کر کے اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تو میں اس کے سوا اور کام نہ کرتا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اقبال ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے تو مشہور تھے لیکن ابھی تمام قوم کے دِل و دماغ پر ان کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اور معقول قیمت پر اردو کتابیں خریدنے کا رواج نہیں تھا۔ مولانا شبلی جیسے مشہور مصنف بھی کوئی علمی کتاب پانچسو سے زیادہ نہیں چھپواتے تھے۔ عرصہ سے احباب مصر تھے کہ اپنا مجموعۂ کلام چھپواؤ لیکن وہ سن کر ٹال دیتے تھے۔ اس بارے میں یہاں تک ٹال مٹول ہوئی کہ حیدرآباد میں ایک صاحب نے اخباروں اور رسالوں سے ان کی تمام مطبوعہ نظمیں جمع کر کے ان کی اجازت کے بغیر اور بغیر ان کو خبر کئے ایک مجموعہ چھپوا کر فروخت کرنا شروع کر دیا جس سے وہ بہت برہم ہوئے۔ کوئی اچھا شاعر اپنے مختلف زمانوں کا کلام جوں کا توں شائع کرنا نہیں چاہتا۔ بعض نظموں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ دنیا انہیں فراموش کر دے بعض اشعار میں ردو بدل کرتا ہے، کہیں کچھ مٹاتا ہے، کہیں اضافہ کرتا ہے۔ کچھ نہ پوچھئے کہ ان صاحب نے کیا غضب کیا اور اقبال کو ان پر کس قدر غصّہ آیا۔

اقبال نے سب سے پہلے اسرار خودی کو اپنے صرفے سے طبع کرایا اور صرف پانچسو نسخے چھپوائے ان میں سے بہت سے نسخے دوست احباب نے اچک لئے۔ جن ملنے والوں کو وہ اس حکیمانہ شاعری کے سمجھنے اور لطف اٹھانے کا اہل سمجھتے تھے ان کو خود بھی ایک نسخہ تحفۃً عنایت فرما دیتے تھے۔ میں اس زمانے میں ایم۔ اے فلسفہ میں پڑھتا تھا اور جب کبھی موقع ملتا فیض صحبت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ اپنے منشی طاہر دین کو بلایا اور کہا کہ ان کو ایک نسخہ دے دو لیکن ان سے قیمت نہ لینا۔ فرمانے لگے ہمارے زمانے کے امراء کی کتب بینی کا شوق ملاحظہ ہو۔ میرے ایک دوست نے اسرار خودی کا ایک نسخہ ایک بڑے دولتمند نواب صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ نواب صاحب کے ایک بڑے بھائی بھی ہیں۔ مجھے خبر ملی ہے کہ وہ دونوں نواب آپس میں اس ایک نسخے پر جھگڑ رہے ہیں کہ یہ کس کا ہے، میرا ہے یا تمہارا، لیکن اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ایک روپیہ خرچ کر کے دُوسرا نسخہ خرید لیں۔

اسی طرح ایک روز ناقدریٔ عالم کی شکایت کرنے لگے میں نے اپنی عمر میں دو تین مرتبہ سے زیادہ کسی تعلی یا تفاخر کا فقرہ ان کی زبان سے نہیں سنا، اپنے آپ کو بڑا بنانا اور بتانا ان کی سیرت کا جزو نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ دیکھو زمانے زمانے کا فرق ہے۔ فیضی کو اکبر مل گیا جس سے فیضی کے کمال نے بھی پرورش پائی اور شہرت دوام بھی حاصل کی، فیضی کے پاس کیا تھا جو میرے پاس نہیں ہے؟ لیکن زمانہ پلٹا کھا گیا ہے۔ اس زمانے میں ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ میں اپنے افکار اور اپنی شاعری کی قوت سے قوم کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر سکتا ہوں۔ یورپ میں

کہی ہوئی دو نظموں میں دو شعر اس احساس کے شاہد ہیں :۔

میں، ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا
زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرف آرزو کا

اسی مضمون کے وہ اشعار بھی ہیں جن میں انہوں نے اپنے رفیق عبدالقادر کو مخاطب کیا ہے۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
شمع کی طرح جیئں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اقبال کی گفتگو میں یہ خوبی تھی کہ ہر قسم کا شخص ان سے ملتا تھا اور وہ ہر شخص کے مذاق کی بات کرتے تھے۔ وہ کافر کے کفر سے ملحد کے الحاد سے، متقی کے تقویٰ سے اور گنہگار کی گنہگاری سے اور رند کی رندی سے براہِ راست واقف تھے۔ اور ہر صنف سے جب وہ بات کرتے تھے تو سننے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ سنی سنائی باتیں کر رہا ہے اور ان کی اصلیت سے واقف نہیں۔ اس لئے ان کی گفتگو کبھی بے معنی اور پھیکی نہیں ہوتی تھی۔ اور ایک بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ ان میں تصنع کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان کو یہ خواہش نہیں تھی کہ لوگ مجھے خواہ مخواہ متقی یا صوفی سمجھیں تصوف کی باتیں صوفیائے کرام کی طرح کرتے تھے لیکن کبھی کسی کو ذلیل کرنے کے لئے اس کی ہنسی

نہیں اڑاتے تھے۔ چونکہ وہ خود ظرافت پسند تھے اس لئے ان کے بے تکلف ہمنشیں بھی ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ میرے سامنے کی بات ہے، لاہور کے ایک حکیم صاحب کبھی کبھی ان کے پاس آبیٹھتے تھے ۔ وہ ذرا رندمشرب تھے، ارباب نشاط کے کوٹھوں پر نظر آتے تھے اقبال نے ہنس کر پوچھا:۔ "فرمائیے حکیم صاحب! آج کل اس طبقے میں کس کس کے ہاں آنا جانا ہے ۔" حکیم صاحب بولے: "جی کہاں! اب تو بس یہیں آنا ہوتا ہے۔"

بعض اوقات علمی باتوں میں بھی ان کا اندازِ بیان ظریفانہ ہوتا تھا۔ ایک روز فرمانے لگے :۔ دو چیزیں خاص انگریزوں کی ایجاد ہیں۔ ان میں ایک ہے پے انگ گیسٹ (یعنی وہ مہمان جس سے اپنے کھانے کی قیمت وصول کی جائے لیکن اس کے باوجود مہمان کہلائے) اور دوسرے دیانتداری بہترین تدبر و مصلحت ہے۔ اور قومیں تو دیانتداری کو دین و ایمان اور اخلاق اور تزکیۂ نفس کے ساتھ وابستہ کرتی رہیں۔ لیکن اس قوم نے اس کو بطور پالیسی کے اختیار کرنے کی تلقین کی۔ اسی طرح فرمایا کہ لوٹ، جبر، ظلم، ناجائز مطالبے، یہ سب کچھ پہلی جابرانہ اور بے آئین حکومتوں میں بھی تھا، اور موجودہ آئینی حکومتوں میں بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب حکومتیں یہ کرتی ہیں کہ جو کچھ کرنا ہو اسے پہلے لکھ لو اور اس کا نام رکھو ضابطہ اور قانون اور پھر جو جی چاہے کر دو، بس اپنے ہر فعل میں کسی قانون اور ضابطہ کا حوالہ دے کر اس کو جائز بنا لو — بس لکھ لینا اور بغیر لکھے کرنا — اصل فرق یہی ہے — اقبال کے ایک دوست بہت سیاہ فام تھے۔ اور اقبال ان کی رنگت پر ہمیشہ طبع آزمائی کرتے رہتے تھے — یہ صاحب ناشٹ یعنی سرہو گئے — اقبال نے کہا:۔

انگریزوں نے تم کو صحیح خطاب دیا ہے لیکن خطاب کیا ہے محض تمہاری حقیقت بیان کر دی ہے تم پہلے بھی نائٹ یعنی شب سیاہ ہی تھے۔ اسی طرح یہ صاحب ایک انگریزی ڈنر میں جس میں اقبال بھی تھے سیاہ سوٹ اور سیاہ موزے اور بوٹ پہنے ہوئے آئے جو رنگ جسم کا تھا وہی لباس کا۔ اقبال نے بڑے تعجب سے ان کو دیکھ کر کہا کہ ارے تمہیں یہ کیا ہو گیا کہ تم برہنہ ہی اس دعوت میں چلے آئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص اقبال کے لطیفے اس کے ہمنشینوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کرے تو ظرافت کا ایک دلچسپ مجموعہ بن جائے۔

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ان کا گھر ہمیشہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا تھا۔ بظاہر یہ تضیع اوقات معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ یہ شخص مطالعہ کب کرتا تھا بڑے بڑے مسائل کے متعلق سوچتا کب تھا اور ہر کس و ناکس کو کیوں اجازت عام تھی کہ جب تک چاہے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا وقت ضائع کرے۔ میں نے تو کبھی ان سے یہ سوال نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ میں خود ان کا وقت ضائع کرنے والوں میں تھا۔ بعض اور لوگوں نے ان سے کہا تو جواب دیا کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوتا رنگ رنگ کے لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں یہ بھی براہ راست نوع انسان کے مطالعے کا ایک ذریعہ ہے اصل مطالعہ انسانی فطرت کا مطالعہ ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی جو میں نے ان کی صحبت میں محسوس کی کہ خواہ کوئی شخص بھی ان کے پاس بیٹھا ہو۔ اور کوئی بات بھی کر رہا ہو۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ سنانے والے کی بات بھی سن رہے ہیں، اور

خود سوچتے بھی جاتے ہیں۔ باتیں کرنے والے کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس وقت کیا عجیب و غریب مضامین اقبال کے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال جس محفل میں بھی ہوتے تھے وہ باہمہ اور بے ہمہ ہوتے تھے سب کے ساتھ بھی ہیں۔ اور سب سے الگ بھی۔ رقص و سرود کی محفل میں بیٹھے ہیں، سب لوگ گانے سے لطف اٹھا رہے ہیں اور اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ لیکن یک بیک اقبال کی طرف جو دیکھا تو کمال رقت سے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ مے و نغمہ جو دوسروں کے لئے نشہ اندوہ ربا تھا وہ اس شخص کو خدا جانے کس سوز و گداز کے عالم میں پہنچا دیتا تھا۔ اقبال کے بعض ہمنشین اس کے انداز طبیعت کو سمجھ گئے تھے۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ اقبال خاموش ہے اور ایک خاص قسم کی کیفیت اس کے چہرے سے نمودار ہے وہ سمجھ جاتے تھے کہ اشعار نازل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے اقبال کو اس کیفیت میں چھوڑ دیتے تھے اس کے بعد ان کو معلوم ہوتا کہ مقدس لاجواب نظم ہم سے باتیں کرنے کے دوران میں ہی ان پر نازل ہوئی۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ اقبال کے لئے کوئی صحبت بھی تضیع اوقات کا موجب نہیں بن سکتی تھی۔

ایسی طبیعت بھی خدا کی بڑی نعمت ہے جس کو جلوت میں بھی خلوت حاصل ہو۔ یہ صوفیاء کے "دست بکار و دل بیار" والا معاملہ ہے یہ لوگ انسانوں کے ساتھ اسی طرح رہتے ہیں۔ جس طرح بطخ پانی میں چاروں طرف سے پانی کے تھپیڑے پڑ رہے ہیں لیکن پَر خشک کے خشک ہیں۔

جنگ کراچی ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء

مولانا ظفر علی خان

اقبالؒ — میرا دوست

اقبال سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ انارکلی والے مکان میں رہا کرتے تھے۔

اس سے پہلے جب میں حیدرآباد میں تھا تو "مخزن" میں ان کی نظمیں دیکھ کر میں نے انہیں ایک خط لکھا جس میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا تھا، اقبال نے بھی اس خط کا جواب بہت دوستانہ پیرائے میں لکھا۔ اور یوں میرے اور ان کے درمیان "قلمی دوستی" قائم ہو گئی۔

جب میں لاہور آیا تو انارکلی والے مکان ہی میں اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ان دِنوں وہ جوان تھے، شباب ان کے چہرے سے پھوٹ پھوٹ پڑتا تھا، پہلی ملاقات میں وہ مجھ سے کھل گئے اور ایسے بے تکلف ہوئے کہ مجھے ان کی دوستی پر مسرت ہونے لگی، اس کے بعد میں ان سے برابر ملتا رہا، ان ملاقاتوں میں اس دور

کے مسائل، شاعری، فلسفے اور نہ جانے کن کن مسائل پر گھنٹوں ہماری گفتگو جاری رہتی اور جب میں ان سے مل کر لوٹتا ہمیشہ مجھے یہی محسوس ہوتا کہ اقبال کو محض ایک شاعر سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے، وہ ایک عظیم المرتبت فلسفی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ ملت اسلامیہ کی حیاتِ نَو کا پیغامبر ہے، اور بعد میں جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میرا یہ خیال پختہ یقین میں تبدیل ہوتا گیا۔

حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب میں نے لاہور سے "زمیندار" نکالا تو اقبال نے میری خواہش پر اس میں پوری پوری دلچسپی لی اکثر وہ "زمیندار" کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھ دیتے جو اس کے صفحۂ اول پر شائع ہوتی تھی اور لوگ اسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، اقبال میں شعر کہنے کی بے پناہ قوت تھی، اور ان کا دل سوز و گداز سے لبریز تھا وہ جو کچھ لکھتے تھے۔ گہرے درد سے لکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اشعار دِل پر اثر کرتے تھے اور ایک ایسی تڑپ پیدا کرتے تھے جو خود شاعر کے دِل میں موجود تھی۔ خود اقبال بھی یہی چاہتے تھے۔ وہ شعر اس لئے نہیں کہتے تھے کہ اپنے آپ کو شاعر منوائیں بلکہ محض اس لئے کہ جس پیغام کو ملت اسلامیہ تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کا مؤثر ذریعہ صرف شعر ہی تھا۔ ویسے بہ حیثیت شاعر کے ان کی شاعری کے تین دَور ہیں۔ پہلا دَور وہ ہے جب وہ ایک سچے وطن پرست تھے اور اسی دَور میں انہوں نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" جیسی نظمیں لکھیں۔ دوسرا دَور وہ ہے جب وہ انگلستان گئے اور وہاں ان پر "پان اسلام ازم" کی تحریک کا رنگ چڑھا اور تیسرا دَور وہ ہے۔ جس میں وہ مستقل طور پر اسلامی فلسفۂ حیات کی طرف مائل ہو گئے اور

آخر دم تک اسی طرف متوجہ رہے۔

اقبال کے مزاج میں ظریفانہ رنگ بھی بہت تھا۔ بے تکلّف دوستوں کی محفل میں وہ خوب کھل کھیلتے تھے۔ اور ایک ایک نشست میں کئی کئی لطیفے کہہ ڈالتے تھے۔ وہ اکبر الہ آبادی کے مزاحیہ کلام کو بہت پسند کرتے تھے اور اکثر ان کے رنگ میں لکھا بھی کرتے تھے۔ مجھے اس قسم کے کلام کا صرف ایک مصرعہ یاد ہے۔

"الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا"

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اقبال بیٹھے بیٹھے ایک آدھ مصرعہ کہہ دیتے اور پھر مجھ سے کہتے کہ میں باقی نظم مکمل کر دوں۔ اسی طرح ایک مرتبہ ہم دونوں نے ایک مشترک نظم کہی جس میں آدھے شعر اقبال کے اور آدھے میرے تھے۔ یہ واقعہ غالباً جولائی ۱۹۱۱ء کا ہے۔ نظم کا موضوع اس دور کے غدار اور ضمیر فروش تھے۔ پوری نظم یہ تھی۔

ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے
کہ اس کی ذات پر نازاں بساط کہنہ و نو ہے
اگر اس کی سلامی کے لئے نواب جھکتے ہیں
تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لو ہے
کئی مسلک کئے ہیں لازمی تعلیم نے پیدا
احد شہ کا کوئی پٹھو کوئی آغا کا پیرو ہے
عجب ہے کھیل قسمت کا کہ پچیسی الیکشن کی
بچھائی شیخ بیچارے نے لالہ کو پڑی پو ہے

نہیں ہے بہر اظہارہ دغا لازم نمودا صلا
کہ بحر شعر میں پانی نہیں مطلق مگر روہے

اقبال بطور دوست ایک بے مثال آدمی تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ "زمیندار" میں، میں نے شعر کی زبان میں ان پر کچھ لطیف چوٹیں کیں مگر انہوں نے کبھی بُرا نہ منایا بلکہ اُلٹا میری نظموں کی تعریف کی۔ یہی "لطیف چوٹیں" تھیں جن کا مطلب بعض لوگوں نے یہ نکالا کہ ہماری دوستی میں فرق آگیا ہے یا اقبال مجھ سے اور میں اقبال سے کبیدہ خاطر ہوگیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیونکہ اقبال کا ظرف بہت بلند تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہرگز رنجیدہ نہ ہوتے تھے اور نہ ان کا کچھ خیال کرتے تھے۔ اس کے برعکس وہ اپنے مخالفوں تک کی بات کو بڑی توجہ اور سکون سے سنتے تھے اور بڑے ہی مدلل اور نچے تلے انداز میں اس کا جواب دیتے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے اقبال کے متعلق جو کچھ بھی لکھا اس کا مقصد ہرگز ان کی مذمت نہ تھا۔ اسے آپ ایک دوست کا شکوہ و شکایت کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی ایک مخلص دوست کا۔

قندیل ۲۱ اپریل ۱۹۵۰ء

حکیم الاُمّت حضرت

علاّمہ اقبال کی وصیّت جاوید کے نام

جاوید کو میری عام وصیّت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار تعلقات رکھے۔ میرے بڑے بھائی کی اولاد سب اس سے عمر میں بڑی ہے، ان کا احترام کرے۔ اور اگر ان کی طرف سے کبھی سختی بھی ہو تو برداشت کرے۔ دیگر رشتہ داروں کو اگر اس سے مدد کی ضرورت ہو اور اس میں ان کی مدد کی توفیق ہو تو اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔ جو لوگ میرے احباب ہیں، ان کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھے، اور اُن سے اپنے معاملات میں مشورہ لیا کرے۔

باقی دینی معاملے میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکانِ دین میں سے نہیں ہیں، سلفِ

صالحین کا پیرو ہوں - اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔
جاوید کو بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہے -
اور اس بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد
کے نئے فرقے مختص کر لئے ہیں - ان سے احتراز کرے -

بعض فرقوں کی طرف سے دنیوی فائدہ ہے - میرے خیال میں بڑا
بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادّی منافع کی خاطر قربان کردے
غرض یہ ہے کہ طریقہ حضرات اہلِ سنّت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا
چاہیئے - اور آئمہ اہلِ بیت کے ساتھ محبّت اور عقیدت رکھنی چاہیئے -

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء

محمد اقبال

آفاق اقبال نمبر ۱۹۴۹ء

شیخ سر عبدالقادر

چند پیش گوئیاں

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کلام کی خصوصیات میں ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی۔ کہ کبھی کبھی کچھ ایسے اشعار ان کے دل سے اُٹھتے تھے جن میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی پیشگوئی ہو۔ اس کے الفاظ بھی پیشگوئی کے رنگ میں ہوتے تھے۔ اور وہ کسی نہ کسی شکل میں بعد کو پوری ہوتی تھی۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ رنگ ان کی شاعری کی ابتداء میں بھی موجود ہوتا اور آخری دَور کے متعلق تو ان کے کلام پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ ان میں ایک رنگ درویشی اور قلندری کا پیدا ہو گیا تھا۔ جس کا دعویٰ ان کے کئی فارسی اور اُردو اشعار میں بھی موجود ہے۔ لیکن تعجب انگیز بات یہ ہے۔ کہ ان کی شاعری کے ابتدائی دَور میں بھی اس قسم کے اشعار جا بجا موجود ہیں۔ جبکہ درویشی اور قلندری ابھی نہاں خانۂ دل میں چھُپی ہوئی تھی۔ اور اس کی علامات آسانی سے نظر نہیں آتی تھیں۔ مثلاً ان کی یہ غزل جو ان کے کلام کے پہلے مجموعہ بانگِ درا

میں چھپی ہوئی ہے۔ اور جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
جہاں سارا بنے گا مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

اس غزل کا ہر شعر بتا رہا ہے۔ کہ شاعر اسلام میں کسی نئی زندگی کے آثار دیکھ رہا ہے۔ اور جس مقدّس سرزمین سے اسلام پہلے اُبھرا اور جس میں پیغمبرِ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے یہ غزل اس کے جمود کے بدلنے اور اس میں جوش اور ولولہ کے نمودار ہونے کی خوشخبری ہے۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے کردیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

جس وقت یہ شعر کہا گیا۔ اس وقت عرب کی بیداری بہت دُور کی بات معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کے بعد خود انہوں نے اور ان کے بعض ہمعصروں نے اس بیداری کا آغاز دیکھ لیا اور جو طلسم جادوگران افرنگ نے عربوں اور ترکوں میں مغائرت پیدا کر کے بنایا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ شکستہ ہوتا نظر آنے لگا۔ جس جوش اور یک جہتی کے ساتھ کچھ وقت کے لئے عربوں نے یہودیوں اور ان کی پشتی بان مغربی حکومتوں کی مجموعی طاقت کا مقابلہ کیا۔ وہ خلاف امید اور حیرت انگیز تھی۔ مگر افسوس ہے۔ کہ ان کی وہ یک جہتی دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ اور اس وقت عرب ممالک کے نمائندے نوساختہ اسرائیلی حکومت سے علیٰحدہ علیٰحدہ سمجھوتے کر رہے تھے۔ تاہم ان کے ابتدائی اتفاق کا کچھ اثر سمجھوتوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ اور ان میں جا بجا

زندگی کے احساسات نمایاں تھے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جو ان کی اس جھڑپ کو جو یہودیوں کے ساتھ ہوئی ہے۔ پہلی جھڑپ سمجھتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ جس شیر کے پھر ہوشیار ہونے کی اُمید ہمارے شاعرِ اعظم نے ظاہر کی ہے۔ اس کا بھی کوئی وقت آنے والا ہے۔

حضرت اکبر الہ آبادی نے کیا خوب نہایت پُر زور اور پُر امید شعر لکھا ہے:۔

ابھی دَور فلک میں اور آنے والے

ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

اس کے بعد حضرت اقبال کی شاعری کا دوسرا دَور آیا جب وہ ۱۹۰۵ء میں یورپ میں مزید تعلیم پانے گئے اور کیمبرج کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے کتاب لکھنے لگے۔ اور بار میں داخل ہوئے۔ اس زمانہ میں ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ مغربی تمدن اور تہذیب کی ظاہری چمک گو بہت لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ مگر وہ در حقیقت اتنی بڑی چیز نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی اور سمجھتی ہے۔ اس وقت ان کی وہ مشہور غزل انگلستان کے قیام کے دوران میں لکھی گئی۔ جس میں اہلِ یورپ سے خطاب کر کے انہوں نے یہ شعر لکھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم سے کئی سال پہلے یہ شعر صادر ہوا جس وقت وہاں کے اچھے اچھے سوچنے والوں کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ جنگِ عظیم جیسی تباہ کن لڑائی قریب ہے۔ یہ پیشین گوئی نہایت صاف ہے

اور اس میں کسی طرح کا ابہام نہ تھا اور شاعر کی زندگی میں حرف بحرف پوری ہوئی۔ پھر زمانہ گذرتا گیا مگر جلد یہ نظر آنے لگا کہ دوسری بڑی لڑائی جو ساری دنیا پر اثر ڈالنے کی جلد آنے کو ہے۔ مگر اس کے واقعی طور پر آنے سے پہلے اقبال مرحوم نے نہ صرف اس کے متعلق پیشگوئیاں کیں بلکہ ایسے انداز سے کہیں کہ جیسے اپنی آنکھوں سے دنیا کے اس انقلاب کو جو اس دوسری جنگ نے پیدا کیا۔ دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا:

خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے
فرنگ کشمکش سیل بے پناہ میں ہے

اسی مضمون کا ایک اور شعر اردو غزل میں آتا ہے جس میں اہل یورپ کی بیرونی طاقت کا اعتراف بھی موجود ہے اور اس کے باوجود یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ ان کا یہ بیچ آسانی سے کھلنے والا نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیوں کر بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

اسی غزل میں یہ دوسرا شعر بھی قابلِ غور ہے:

شفق نہیں ہے یہ مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رو کہ دوش و امروز ہے فسانہ

اس دور کی شاعری میں ایسی مثالیں اور بھی بہت سی ملتی ہیں مگر اس مختصر مضمون میں ان سب کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

امروز ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء

محمد عبداللہ قریشی

اقبال گواہوں کے کٹہرے میں

۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر کی سرگرمیاں لاہور میں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ڈوگرہ حکمران نے کشمیری مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور مسلمان اکثریت کو ہندو اقلیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اس ظلم و تعدی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی عوامی جلسوں اور احتجاجی جلوسوں کے ذریعے کشمیر کے مظلوم و بیکس مسلمانوں کے لئے اظہار ہمدردی کیا جا رہا تھا۔

شروع شروع میں باغ بیرون موچی دروازہ میں عوامی جلسے منعقد ہوئے۔ ان جلسوں میں جن لوگوں نے سرگرمی سے حصّہ لیا۔ ان میں میاں نظام الدین، حاجی رحیم بخش، سید محسن شاہ (یہ سب ممتاز کشمیری حضرات تھے) اور اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر علم الدین سالک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر نے نہ صرف ان جلسوں کا اہتمام کیا۔ بلکہ ان جلسوں میں جو قرار دادیں منظور ہوئیں وہ بذریعہ تار سیکرٹری آف سٹیٹ، وائسرائے،

پولیٹیکل ایجنٹ۔ مہاراجہ کشمیر اور دوسرے متعلقہ افسروں کو بھجوائیں۔ عام مسلمانوں کے اس اظہار ہمدردی سے برصغیر کے سربرآوردہ مسلمان سیاسی اور مذہبی رہنما بھی متاثر ہوئے شملہ میں ان کا اجلاس ہوا اور کشمیر کمیٹی معرضِ وجود میں آئی۔ علامہ اقبالؒ اس کمیٹی کے صدر تھے یہ کمیٹی کشمیری مسلمانوں کی قانونی امداد کے لئے معرضِ وجود میں لائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی کاوشوں کی بدولت ایسے متعدد کشمیری مسلمانوں کو رہائی نصیب ہوئی جو ریاستی جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ کمیٹی نے قومی کارکنوں کی مالی اعانت بھی کی۔ کچھ عرصہ کے بعد تحریک کشمیر کی قیادت مجلس احرار کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ لاہور میں تحریک کی سرگرمیوں کا مرکز اب باغ بیرون موہلی دروازہ میں منتقل ہو گیا۔ تحریک کشمیر اب سارے برصغیر میں پھیل چکی تھی اور سارا متحدہ ہندوستان "کشمیر چلو" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔

یہ تھا وہ وقت جب اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ زاویہ نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ کشمیر میں جمہوری طرز کی حکومت کا مطالبہ بھی فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ اور ہندوؤں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان محض اس وجہ سے مہاراجہ کشمیر کے خلاف تحریک شروع کئے ہوئے ہیں کہ وہ ہندو ہے۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اگر کشمیر میں جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو گئی تو اس طرح کشمیر مسلم اکثریت کا طبقہ بن جائے گا۔ اور ریاست میں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ ہندوؤں نے اس تحریک کی مخالفت شروع کر دی۔ انہوں نے جوابی اقدام کے طور پر حیدر آباد (دکن) کے مسلمانوں کے خلاف تحریک شروع کر دی اور "دکن چلو" کا نعرہ بلند کیا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور کے مسلمانوں نے مجلسِ احرار کے زیرِ اہتمام ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ یہ جلوس اگرچہ انتہائی پُرامن تھا لیکن ہندو مشتعل ہو گئے۔ اور انہوں نے

بھی ۲۶ دسمبر کو اسی قسم کا ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس کا منتظم اور راہنما مچھی ہٹہ (شاہ عالمی) کا ہندو تاجر بیلی رام ٹلّ والا تھا۔ وہ ایک انتہا پسند متعصب ہندو تھا۔ یہ جلوس اشتعال انگیز نعرے لگاتا ہوا سرکلر روڈ سے گزر کر موچی گیٹ کی طرف بڑھا۔ پولیس کی حفاظت میں جلوس کے کچھ لوگ موچی دروازہ میں داخل ہو گئے اور بعض مسلمان دوکانداروں کو زدوکوب کیا۔ اُو پنجی مسجد اور مسجد مُلا محمد صالح کمبوہ (عہد شاہجہانی کا مشہور مؤرخ) سے ملحقہ دوکانوں کے مسلمان تاجر ہندو غنڈوں کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو پریشان کر دیا۔ ہندو جلوس کا رویّہ انتہائی اشتعال انگیز تھا۔ چنانچہ مسلمان بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر سالٹیری نے سختی سے کام لیتے ہوئے انہیں منتشر کر دیا۔ سیّد عبدالقادر اور مولانا علم الدین سالک نے مسٹر سالیٹری کے رویّہ کے خلاف سخت احتجاج کیا لیکن ڈپٹی انسپکٹر جنرل نے چنداں پرواہ نہ کی اور صورتِ حال اور خراب ہو گئی۔ مسٹر سالٹیری اور متذکرہ دونوں اصحاب کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ دریں اثنا جلوس بڑھتا گیا۔ مسٹر سالٹیری جلوس کے ساتھ تھے۔ جب جلوس انارکلی بازار میں پہنچا تو بعض غیر ذمہ دار ہندو نوجوانوں نے ایک مسلمان نور محمد پر حملہ کر دیا۔ نور محمد موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ یہ مسلمان نوجوان مسجد وزیر خاں اور پرانی کوتوالی کے درمیان کوچہ ککے زئیاں کا رہنے والا تھا۔

نور محمد کے بہیمانہ قتل کی خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور ہندو مسلم فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ جلوس منتشر کر دیا گیا اور نور محمد کا لاش پوسٹ مارٹم کے لئے میو ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ اگلے روز نور محمد کی میت پولیس نے مقبرہ گھوڑے شاہ کے قریب قبرستان میں نور محمد کے رشتہ داروں کے حوالے کی۔ دفعہ ۱۴۴

کے باوجود ہزاروں مسلمان جنازے میں شریک ہوئے۔ ڈپٹی کمشنر لاہور پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ قبرستان میں موجود تھے۔ ڈپٹی کمشنر کی استدعا پر کارپوریشن کے پہلے میئر میاں عبدالعزیز (بارایٹ لاء) نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ گھروں کو چلے جائیں لیکن اس اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ مشتعل مجمع ایک جلوس کی صورت اختیار کر گیا اور پھر شہر میں فسادات کا ایک دور شروع ہو گیا۔ ہندوؤں کو اگر موقعہ ملتا تو وہ مسلمانوں پر حملہ کر دیتے اور اگر مسلمانوں کو موقعہ ملتا تو وہ ہندوؤں پر حملہ کر دیتے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ساڑھے تین بجے سہ پہر کے قریب کسی نے چوک رنگ محل میں ایک ہندو دوکاندار لال چند کو چاقو مار دیا۔ حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ گردو نواح کے ہندو دوکاندار موقع پر جمع ہو گئے۔ پولیس آئی اور مجروح لال چند کو وچھووالی سٹریٹ (اندرون شاہ عالمی) کے گنگارام ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہسپتال میں ایک مجسٹریٹ درجہ اوّل سردار کہر سنگھ نے لال چند کا مدعی بیان قلمبند کیا۔ لال چند نے اس بیان میں کہا کہ اس پر حملہ غلام مصطفےٰ نے کیا تھا جس کی رنگ محل میں ایک دوکان ہے اور جو کوچہ چابک سواراں میں رہائش پذیر ہے۔ لال چند زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا اور اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے میو ہسپتال میں پہنچا دی گئی۔

غلام مصطفےٰ کا نام لال چند کو بعض ہندو لیڈروں نے سمجھایا تھا۔ لیکن اس امر کی کوئی شہادت موجود نہ تھی کہ حملہ آور غلام مصطفےٰ ہی تھا۔ دراصل غلام مصطفےٰ کو اس مقدمہ قتل میں پھنسانے کی سازش اس وقت کی ہندو ذہنیت کا شاہکار تھی۔ مسجد مولوی فضل الٰہی کے نیچے چند دوکانیں تھیں۔ ان میں سے ایک دوکان دس سال پہلے شیخ غلام مصطفےٰ کے قبضہ میں تھی جہاں وہ کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ان دنوں شیخ صاحب کی دوکان سیاسی کارکنوں

اور اہلِ قلم کی جولانیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔

شیخ غلام مصطفٰے خود بھی پنجابی شاعر تھے اور حیرتؔ تخلّص کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ماہنامہ "فردوس" اور ایک مزاحی ہفت روزہ "آقا باقا" نکالتے تھے۔ شیخ صاحب کی دوکان پر جو لوگ اکثر آیا کرتے تھے ان میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ماسٹر محمد بخش مسلم، ملک لال دین قیصر، ڈاکٹر نذیر احمد، کرنل مجید ملک، ابو الاثر حفیظ جالندھری، غلام عباس، پروفیسر علم الدین، استاد ہمدم اور استاد عشق لہر کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ غلام مصطفٰے حیرتؔ اور ملک لال دین قیصر، نظام کمیٹی، ودنشن کمیٹی، علم الدین شہید کی میّت کی واپسی، شاردا ایکٹ اور ظفروال میں اذان پر بندش ایسی تحریکوں کو سرگرمی سے چلاتے رہے تھے۔ ہندو ان سے نفرت کرتے تھے۔ اور انہیں کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسانا چاہتے تھے۔ اب انہیں ایک موقعہ ہاتھ آیا تھا۔

لال چند نے غلام مصطفٰے کا نام لیا تھا۔ لیکن استغاثہ کے گواہوں نے لال دین اور علم الدین پر بھی الزامات عائد کئے۔ مگر پولیس کے پاس اب کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جس سے وہ ثابت کر سکے کہ لال دین سے مراد لال دین قیصر ہے۔ پولیس نے شیخ مصطفٰے حیرتؔ کو گرفتار کر لیا۔ کیونکہ وہ نزدیک ہی رہتے تھے۔ اپنے علاقہ میں مشہور تھے اور اس وقت کارپوریشن میں ملازم تھے۔ لیکن لال دین قیصر کی بجائے ایک اور لال دین کو گرفتار کر لیا گیا جو راج (معمار) کا کام کرتا تھا غلام مصطفٰے کے خلاف تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۰۲ اور لال دین کے خلاف دفعات ۳۲۳ اور ۵۰۴ کے تحت مقدمات درج کر لئے گئے۔ ابتدائی سماعت کے بعد ملزمان سیشن سپرد کر دئے گئے۔ شیخ غلام مصطفٰے کو بے قصور ثابت کرنے کی غرض سے کئی ممتاز مسلمان عدالت میں پیش ہوئے۔ صفائی کے کل گواہوں کی تعداد ۴۶ تھی جن میں حاجی میر شمس الدین (سیکرٹری انجمن

حمایت اسلام) نواب سر ذوالفقار علی (رکن مرکزی مجلس دستور ساز) غلام محمد، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، میاں عبدالعزیز (چیئرمین میونسپل کمیٹی لاہور) شیخ صادق حسن، کرنل مجید ملک، مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خواجہ دل محمد، سیّد عبدالقادر اور پروفیسر علم الدین کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ صفائی کا ایک گواہ ملک نبی بخش جائے واردات پر موجود تھا۔ لال چند زخمی ہونے کے بعد پناہ کے لئے نبی بخش کے ہاں گیا تھا۔ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اور ملک نبی بخش کے بیان میں بڑا تضاد تھا۔ استغاثہ نے ملک نبی بخش کی ضعیفی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اسے فاتر العقل ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن ملک نبی بخش نے ہر سوال کا جچا تلا جواب دیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی لغزش نہ کی۔ اس عدالت نے ملک نبی بخش سے استفسار کیا کہ کیا حادثہ کے وقت اس کے پاس گھڑی موجود تھی۔ ملک نبی بخش نے جواب دیا کہ وہ گھڑی پر وقت دیکھنا جانتا ہی نہیں۔ عدالت نے پوچھا "تو پھر آپ کو حادثہ کے صحیح وقت کا کیسے علم ہو گیا۔" اس پر ملک نبی بخش نے جواب دیا "میں سورج اور ستاروں کو دیکھ کر وقت بتا سکتا ہوں" سیشن جج نے کہا۔ "تو بھلا اب کیا وقت ہے"۔ گواہ نے کسی دِقت کے بغیر صحیح وقت بتا دیا۔ عدالت کا کلاک ملک نبی بخش کی پشت پر تھا۔ اس کی سوئیاں وہی وقت ظاہر کر رہی تھیں جو ملک نبی بخش نے بتایا تھا۔ سیشن جج اس بات سے بہت متأثر ہوا۔ اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ گواہ سچ بول رہا ہے۔

مقدمے کی سماعت کئی روز جاری رہی۔ اس زمانے میں سیشن جج مسٹر جے کے ایم ٹیپ تھے۔ جن کے نام پر پنجاب ویٹرنری کالج کے سامنے کی سڑک اب تک موجود ہے۔

مسٹر ٹیپ نے اس مقدمہ کی سماعت کے لئے عدالت کا اجلاس مسجد شاہ چراغ میں منعقد کیا جو ابھی مسلمانوں کو واگزار نہیں کی گئی تھی۔ بعد میں یہی مسٹر ٹیپ لاہور ہائیکورٹ کے قائمقام جج رہے تھے۔

علامہ محمد اقبالؒ نے اس مقدمہ میں ذاتی دلچسپی لی۔ وہ شیخ غلام مصطفٰے کے نام جیل میں خط لکھتے اور انہیں تسلّی و تشفی دیتے رہے اور انہیں اپنی مکمل اعانت کا یقین دلایا۔ ایک خط میں علامہؒ نے شیخ غلام مصطفٰے کو لکھا کہ وہ "یا حی یا قیوم" کا ورد کیا کریں۔ ان کی مشکلیں آسان ہوں گی اور سکون قلب نصیب ہوگا۔ بدقسمتی سے علامہ اقبال کے یہ تمام خطوط شیخ غلام مصطفٰے کے مکان میں آتشزدگی کے باعث ضائع ہوگئے۔

علامہ اقبالؒ مسلسل عدالت میں جاتے رہے اور خواجہ فیروز الدین (وکیل صفائی) کو مشورے دیتے رہے۔ ۲ر اگست ۱۹۳۲ء کو علامہ نے سیشن جج کی عدالت میں حسب ذیل بیان دیا۔

"میں ملزم غلام مصطفٰے کو چند برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ ایک ادبی پرچہ "فردوس" نکالتے تھے۔ بعد میں انہوں نے ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا۔ میں نے انہیں عام اسلامی تحریکوں میں حصّہ لیتے بھی دیکھا ہے۔ غلام مصطفٰے نے کئی جلسوں میں میری موجودگی میں سیاسی و سماجی مسائل پر تقاریر کی ہیں انہوں نے ۵۶ فیصد حقوق کی تحریک میں بھی حصّہ لیا۔ یہ تحریک لاہور کے مسلمانوں نے شروع کی تھی۔ غلام مصطفٰے نے ان جلسوں میں بھی حصّہ لیا جو میکلیگن انجینئرنگ کالج کے ضمن میں ہوئے تھے۔ غلام مصطفٰے نے علم دین کی تدفین کے سلسلہ میں میری اور سر محمد شفیع کی اعانت کی تھی۔ غلام مصطفٰے کو ایک ممتاز مسلم کارکن کہا جا سکتا ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے استغاثہ کی جرح پر کہا "غلام مصطفٰے سیاسی معاملات میں ذاتی طور پر میری اعانت نہیں کرتے وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ میرے ساتھ الہ آباد گئے تھے جہاں

میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔"

علامہ کے بیان کے بعد عدالت نے صفائی کے کسی اور گواہ کا بیان قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ خواجہ فیروز الدین نے علامہ اقبال کے مشورے پر اپنے دلائل میں اس بات پر زور دیا کہ استغاثہ کے کسی بھی گواہ نے لال چند کے اس بیان کی تصدیق نہیں کی کہ غلام مصطفےٰ کی رنگ محل میں دوکان تھی۔ بالآخر یہ مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ ملزم کو بے قصور قرار دیا گیا اور آٹھ ماہ تک سختیاں جھیلنے کے بعد شیخ غلام مصطفےٰ کو رہائی نصیب ہوئی۔ لاہور کے مسلمانوں نے جشن منایا اور مولانا ظفر علی خاں نے "فیصلہ تقدیر" کے عنوان سے "زمیندار" کے صفحہ اوّل پر نظم شائع کی۔ جس کا مصرعہ تھا "ٹل گیا انگریز کے دارالقضا کا فیصلہ۔"

(اقبال ریویو اپریل ۱۹۶۱ء سے اخذ و ترجمہ)

نوٹ: وقت ۲۱ر اپریل ۱۹۶۲ء

خواجہ عبدالرحیم بارایٹ لاؔ

مزارِ اقبال کیونکر بنا

بیسویں صدی کے نصف اوّل کا دم واپسیں تھا کہ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو حکیم الامّت علاّمہ اقبال نے سفرِ آخرت اختیار کیا ؎

سرآمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ہمارے سامنے ان کی رحلت کے فوراً بعد یہ سوال تھا کہ قوم کے اس مایۂ ناز فرزند کو سپردِ خاک کرنے کے لئے کون سی جگہ موزوں ہو سکتی ہے یہ سوال اس لئے بھی اہم تھا کہ ہم ایک ایسے وجود کو لحد میں اُتارنے والے تھے جس کی تاریخ ساز شخصیّت نے نہ صرف مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کا ساز و سامان مہیا کیا بلکہ قدرت نے اس کی ذاتِ گرامی پر قبول عام اور شہرت دوام کی غیر فانی مہریں ثبت کر دی تھیں۔ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے دنیائے اسلام کی رگ و پے

ہیں نشاۃ ثانیہ کی رُوح پھونکی اور تقدیرِ امم کی تعمیر و تشکیل کے لئے مستقبل میں جو تاریخی کردار اس دنیا کو ادا کرنا تھا اس کا شعور بھی اسی مردِ حق آگاہ نے بیدار کیا۔ اس برصغیر کے مسلمان اِس حقیقت سے اس کی حکیمانہ تعلیمات ہی کی بدولت آگاہ ہوئے کہ وہ من حیث المسلمین ایک قوم ہیں۔ اور انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی قومی سالمیت کے تحفظ کی خاطر ایک جداگانہ ملک کا مطالبہ کریں۔ تاکہ انہیں اپنی امتیازی ذکاوت، دین و دیانت، تاریخ و سیرت اور ماضی کی پرشکوہ روایات کے مطابق معیشت و معاشرت کے مواقع میسر آسکیں۔ یہی وہ سروشِ غیبی تھا۔ جس نے اُمتِ مسلمہ کو یہ رُوح پرور پیغام دیا کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اس نے اپنی قوم پر یہ حقیقت واضح کی کہ اس کے افراد کی قسمت میں محض ہیزم کشی اور سقّائی کے گرے پڑے پیشے نہیں ہیں بلکہ یہ تو وہ ہیں جن کے نقوشِ قدم کبھی خورشید در آغوش بھی ہو سکتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

غرض یہ تھی وہ عبقریت مآب شخصیت جس کی ابدی خوابگاہ کے لئے موزوں ترین مقام کے انتخاب کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ حکیم الامّت کے عقیدت کیش جاں نثار چودھری محمد حسین مرحوم، راجہ حسن اختر (جنہیں بارہ سال تک علامہ کی صحبت سے فیض یابی کے مواقع میسّر آئے) اور دیگر متعلقین نے یہ فیصلہ کیا کہ

شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے قریب حکیم الامت کی آرام گاہ بنے۔ موزوں ترین مقام یہی ہو سکتا ہے۔

صوبائی حکومت کے سربراہ سر سکندر حیات خاں مرحوم نے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا۔ سر سکندر حیات خاں پنجاب سے باہر دورہ پر تھے کہ میاں امیرالدین نے انہیں تار کے ذریعے مذکورہ مقام پر تدفین کی اجازت طلب کی۔ لیکن انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ اور یہ متبادل تجویز پیش کی کہ اسلامیہ کالج کے میدان میں اس مقصد کے لئے کسی مقام کا انتخاب کیا جا سکتا ہے ــــ مسلمانانِ لاہور کی ملی جلی آرزوؤں کا احترام کرتے ہوئے علامہ کے عقیدت کیش اپنے فیصلے پر جمے رہے۔ اس اثنا میں حیرتناک صورت حال یہ پیش آئی کہ خود گورنر صوبہ سر ہنری کریک نے بروقت ان کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کیا۔ اس شریف النفس انگریز کی مدد سے ان تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا جو محکمہ آثار قدیمہ سے گفت و شنید کے سلسلہ میں پیش آئیں۔ کیونکہ یہ مقام اسی محکمہ کی زیرِ نگرانی تھا۔ مختصر یہ کہ حکیم الامت کی تدفین کے لئے مطلوبہ مقام کی اجازت مل گئی۔ اس آرام گاہ کے انتخاب سے حکیم الامت کی وہ آرزو بھی پوری ہو گئی جس کا اظہار موصوف نے اپنی بصیرت کی بنا پر اس شعر میں کیا تھا ؎

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیا ساید دل بے تاب من
بستگی پیدا کند سیماب من

بافلک گویم کہ آرا مم نگر
دیدۂ آغازم انجامم نگر

سکھ ہندو رہنما اس مقام تدفین کے انتخاب پر بہت جز بز ہوئے۔ مزار کی تعمیر، تعمیری سامان کی فراہمی اور دیگر معاملات کے سلسلہ میں مزار کمیٹی نے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان میں کافی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے سکھ وزیر سردار سندر سنگھ مجیٹھیا نے جو تعمیرات کے سلسلے میں اجازت دینے یا نہ دینے کے کلی اختیارات رکھتے تھے۔ سختی کے ساتھ مزاحمت کی۔ جب میاں امین الدین جو قیام پاکستان کے بعد پنجاب کی گورنری کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے میڈیکل اینڈ لوکل سیلف گورنمنٹ کے محکموں کے سیکرٹری مقرر ہوئے تو راستہ کی تمام مشکلات رفع ہوگئیں موصوف کی کوششوں سے تعمیرِ مزار کے سلسلے میں اجازت یابی کے تمام مرحلے طے ہوگئے۔

مزار کی تعمیر کا جو نقشہ زیرِ تجویز تھا اور اس کے سلسلہ میں جو تدابیر زیرِ غور تھیں ان کی تکمیل و اتمام کی راہیں بعض وزراء اور سرکاری افسروں کے ناہم کارانہ طرزِ عمل سے بہت بڑی حد تک مسدود ہو کر رہ گئیں، بعض دشواریاں ایسی بھی تھیں جو مزار کے محل وقوع اور ان اقدار پر اثر انداز ہوتی تھیں جو مزار کے مجوزہ نقشہ کی رو سے اس کی ہیئت ترکیبی کا جزو لازم قرار دی گئی تھیں۔

الف :- مزار کسی صورت میں بھی صحن مسجد کی فصیل سے اونچا نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ تعمیر مزار کی اونچائی دس بارہ فٹ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

ب :- نقشۂ تعمیر گرد و پیش کی تعمیرات کے عین مطابق ہو۔

ج :- الف اور ب کی قیود کے باوجود یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ مزار کی تعمیر

اس اندازہ کی ہونی چاہیئے کہ اس سے اقبال کے فلسفۂ خودی اور نظریۂ قوت وغیرہ کی شان نمایاں ہو جائے۔ مرحوم چودھری محمد حسین کی تمنا تھی کہ مزار اقبال اس حقیقت کا مظہر ہو۔

جہانگیری بخاکِ ما سرشتند
امامت بر جبینِ ما نوشتند
درونِ خویش بنگر آں جہاں را
کہ تخمش در دلِ فاروق کشتند

مزار کمیٹی نے تعمیر کے سلسلہ میں ان تمام ماہرین فن تعمیر کے مشوروں سے استفادہ کیا جن تک آسانی سے رسائی ہو سکتی تھی۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ حیدر آباد دکن کے نواب زین یار جنگ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انجام کار انہی کے تعمیری خاکے کے مطابق مزار کی تعمیر ہوئی۔ لیکن اس موقع پر ہمیں بلا تامل یہ کہہ دینا چاہیئے کہ ان کے پہلے اور بعد کے خاکے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلے خاکہ سے صاف یہ نظر آتا تھا کہ یہ کسی بلبل کا قفس ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اسے کالعدم قرار دیا گیا۔

مجھے خوب یاد ہے۔ نواب زین یار جنگ بہادر شاہی مسجد میں تھے اور چودھری محمد حسین مرحوم انہیں یہ سمجھا رہے تھے کہ گرد و پیش کی عمارات میں مزار کی کیا حیثیت اور کیا اہمیت ہے۔ اس وقت ان کے ہمراہ راجہ حسن اختر، میاں امین الدین اور مرحوم سر سکندر حیات خاں بھی تھے۔ چودھری صاحب مرحوم کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی اور ان کی زبان پر یہ فقرے کہ مزار

کے غرب میں شاہی مسجد ہے جس سے اسلام کی روحانی طاقت کی آئینہ داری ہوتی ہے ۔ اس کے بالمقابل مشرق میں شاہی قلعہ ہے جو اسلام کی دنیاوی عظمت کا مظہر ہے ۔ تیسری سمت رنجیت سنگھ کی مڑھی ہے جو اسلام سے بغاوت کی یادگار ہے ۔ چوتھی جانب حکیم الامّت کا مزار ہے جنہیں مجدّدِ ملت کہا جاسکتا ہے ۔ مزار اقبال کا نقشہ کچھ ایسا ہونا چاہیئے کہ سنگ وخشت کی خاموش زبانیں حقیقت کی ترجمانی کریں ۔ اور ان کی ترتیب وتعمیر سے اس حقیقت کا انکشاف ہو کہ اقبال کا کلام اور اس کا پیام فقر وسلطنت اور درویشی وشاہی کا ایک حسین امتزاج تھا ۔

ان توجیہات سے نواب زین یار جنگ بہادر کے دماغ میں تخلیق وایجاد کی برقی رو دوڑ گئی ۔ اور پہلے سے ان کے ذہنی تصوّرات میں جو نقشہ بسا ہوا تھا ، اس کی بساط ہی اُلٹ گئی ۔ دکن کے اس ماہر تعمیرات نے از سرِ نو کام کا آغاز کیا ۔ صلاح ومشورہ کے بعد موصوف نے وہ تعمیری خاکہ تیار کیا جسے انجام کار قبول خاص وعام کی سند ملی ۔ مزار کمیٹی نے شروع دِن سے یہ تہیہ کیا تھا ۔ کہ وہ مزار کی تعمیر کے سلسلہ میں عوام سے چندہ کی اپیل نہیں کرے گی ۔ اور وہ اس لئے کہ مزار کمیٹی کو معلوم تھا کہ حکیم الامّت عوامی چندوں اور سرکاری مدد کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے ۔ مزار کمیٹی نے ایک حکمران اور ایک بہت بڑے تاجر کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ۔ یہ اس شرط پر تعمیر کے جملہ مصارف برداشت کرنے کے لئے آمادہ تھے کہ ان کے ناموں کی تختیاں مزار کے ساتھ نصب کردی جائیں ۔ کمیٹی ایسی پیش کش قبول نہیں کر سکتی تھی ۔ اقبال اپنی قوم کا اقبال تھا ۔ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ، یہ

کیسے گوارا کیا جا سکتا تھا کہ اس کے نام کی آڑ میں حکمرانوں اور تاجروں کی دولت و ثروت کے چراغ جلیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد مسٹر غلام محمد مرحوم نے جبکہ وہ وزیر مالیات تھے، حکومت کی طرف سے تعمیرِ مزار کے لئے کچھ رقم کی پیش کش کی۔ لیکن مزار کمیٹی نے اپنی سابقہ روایات کے پیشِ نظر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کمیٹی کو اس امر سے ایک گونہ مسرّت اور اطمینان ہوا کہ مزار کی تعمیر حکیم الامّت کے خیر خواہوں اور عقیدت کیشوں کی نجی کوششوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

مزار کے بیرونی حصّے پر سنگِ سُرخ اپنی چھب دکھا رہا ہے اور یہ اس مناسبت سے کہ شاہی مسجد کا بیرونی حصّہ بھی سنگ سُرخ کا جامہ زیب تن کئے ہوئے ہے۔ مزار کے اندرونی حصّہ میں مکرانی سنگِ مرمر کی سلیں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں قسم کے پتھر راجپوتانہ سے درآمد کئے گئے تھے۔ ہر دو قسم کے پتھروں کے درآمدی مال کی آخری قسط ابھی راستے ہی میں تھی کہ تقسیم ملک کا سلسلہ پیش آگیا۔ اس لئے یہ سامان کھوکھرا پار کے راستے منگانا پڑا۔ فروری ۱۹۵۰ء کو تعمیر کی مہم سر ہوئی۔ مسٹر بشیر احمد انجینئر انچارج نے تعمیر کے سلسلہ میں رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔

مزار کی حسب ذیل خصوصیات قابلِ ذکر ہیں :-

(۱) مزار کی چھت تمثیلی اشاریت کی حامل ہے۔ اس کے وسط میں اسم "محمدؐ" کندہ ہے۔ چاروں گوشوں میں اقبال کا نام ہے۔ اس انداز میں کہ ہر نام کی ایک برقی لہر مرکز کی طرف مائل ہے۔ اس تمثیلی اشاریت سے یہ اظہار مقصود ہے کہ اقبال نے جس مرکز انوار سے اقتباس نور کیا ہے وہ ذات ہے نبی کریم صلعم کی اور انہی کی الہامی تعلیمات کا

پرتو اس کے کلام اور اس کے پیغام پر پڑتا ہے۔ (۲) مغربی دیوار پر بخط کوفی قرآن حکیم کی یہ آیہ شریفہ کندہ ہے۔ جو حکیم الامّت کو بیحد مرغوب تھی۔

كلمةً طيبةً كشجرةٍ طيبةٍ ... الخ

(۳) مندرجہ ذیل اشعار جو چودھری محمد حسین مرحوم کے خیال کے مطابق حکیم الامّت کے نصب العین اور پیغام کا ملخص پیش کرتے ہیں۔ بخطِ نستعلیق مزار کی چہار دیواری پر کندہ ہیں۔

دم مرا صفت بادِ فرودیں کردند
گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند
نمود لالۂ صحرانشیں ز خونابم
چنانکہ بادۂ لعلے بساتگیں کردند
بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں
ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند
فروغِ آدم خاکی ز تازہ کاریہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند
چراغ خویش برافروختم کہ دست کلیم
دریں زمانہ نہاں زیر آستیں کردند
درآ بسجدہ دیاری ز خسرواں مطلب
کہ روز فقر نیاگاں ما چنیں کردند

مارچ ۱۹۵۰ء میں جب شاہ ایران نے مزار اقبال کی زیارت کی تو وہ ان اشعار

سے بہت متاثر ہوئے ۔ خطاطی سے متعلق شاہ موصوف نے ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا:۔

"خوش خطی خوب است"

یہ خطاط وہی ماہرِ فنِ خطاطی عبدالمجید پروین رقم ہیں جنہوں نے اپنی ندرت فن اور اپنے فن کارانہ کمال کا مظاہرہ چودھری محمد حسین مرحوم کی ترغیب اور ان کی عقاب نگاہی کی بدولت کچھ ایسے بے نظیر انداز میں کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی — چودھری محمد حسین کو فنون لطیفہ سے خاص شغف تھا ۔ اور ان کی نگاہ احتساب زشت و خوب میں بڑی بالغ نظری کے ساتھ امتیاز کرتی تھی ۔ اس کا اندازہ اقبال کے دواوین میں متن اشعار کی کتابت اور طباعت کی نفاست سے کیا جا سکتا ہے۔ چودھری صاحب موصوف کتابت کے حسن و قبح پر کڑی نگاہ رکھتے اور اس سلسلہ میں گرم جوشی کے ساتھ اپنی توجہات صرف کرتے تھے ۔

کافی غور و خوض کے بعد چودھری صاحب موصوف نے بھی بعض اشعار کا انتخاب کیا تھا اور جن کے بارے میں یہ طے ہے کہ انہیں بھی کندہ کرایا جائے گا ۔

مزار کی دیوار کے اس بیرونی حصہ پر جو شاہی مسجد کی سیڑھیوں کی جانب ہے ایک تختی نصب ہے جس پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں :۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم

چناں نالیم اندر مسجد شہر
کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

ان اشعار میں ہماری بے رُوح قیادت پر پوست کندہ تنقید کی گئی ہے اور قوم کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے فریاد کرے۔ یعنی آمادہ کار ہو۔ تاکہ بے رُوح قیادت کے پہلو میں جو دِل ہے پگھلے اور قوم کی فریاد کان دھر کر سُنے یعنی جو فرائض منصبی اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہو۔

تعویذ مزار حکومت افغانستان کا عطیہ ہے۔ سردار صلاح الدین سلجوقی جو تقسیم سے قبل کئی سال تک نئی دہلی میں افغان قونصل جنرل تھے۔ اس عطیہ تعویذ کے اخذ و حصول اور داد و دہش کا شرف انہی کو حاصل ہے۔ اس وقت اس عطیہ کی مالیت تین لاکھ (کابلی) کے قریب تھی۔ سلجوقی سردار اقبال کا عقیدت کیش تھا۔ اور جب حکیم الامّت کی وفات کے بعد یہ سردار فاتحہ خوانی کے لئے لاہور آیا تو یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ ایک یتیم لاوارث بچے کی طرح اپنے شفیق باپ کی یاد میں دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ تعویذ افغانستان کے نہایت بیش قیمت پتھر سے تیار کیا ہوا ہے۔

کابل میں شہنشاہ بابر کے مقبرہ میں بھی یہی پتھّر استعمال کیا گیا ہے۔ سفید فام پتھر پر جو دیکھنے میں بڑا حسین و جمیل ہے مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں جن میں اقبال کی تعلیم کا بنیادی رُخ نظر آتا ہے:۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

ان اشعار میں وہ بنیادی صداقت پیش کی گئی ہے کہ اگر تمام مسلم اقوام نظری و

عملی حیثیت سے اس پر عمل پیرا ہوں تو وہ ایک نئی دنیائے اسلام کی تعمیر کر سکتے ہیں اور ایسی تعمیر جو آج کی پریشاں حال اور مصیبت زدہ دنیا کے استحکام کا باعث ہو۔ دنیائے اسلام سے باہر جن نظامات و دساتیر پر عمل ہو رہا ہے اور جن کے مطابق تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری ہے ان سے قطع نظر مسلم ممالک معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے اپنی بنیادیں مستحکم کر سکتے ہیں اقبال مندرجہ ذیل اشعار میں تقدیر ملّت کی تعمیر کے اسرار کا انکشاف کرتا ہے۔

بمنزل کوش مانند مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بندو راہ مصطفٰے رو

اُمّت مسلمہ کے تاریخی کردار کی جانب ان اشعار میں اشارے ہیں :۔

میاں امتاں والامقام است
کہ آں اُمت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کار آفرینش
کہ خواب و خستگی بروے حرام است
وجودش شعلہ از سوز درون است
چو خس اورا جہان چند و چون است
کند شرح انا الحق ہمت او
پے ہر کن کہ می گوید یکون است

پرد در وسعت گردون یگانہ
نگاہ او بہ شاخ آشیانہ
مہ و انجم گرفتار کمندش
بدست اوست تقدیر زمانہ
بباغاں عندلیبے خوش صفیرے
براغاں جرہ بازے زود گیرے
امیر او بسلطانی فقیرے
فقیر او بدرویشی امیرے

غلام رسول آزہر

میری ڈائری کا ایک ورق

میرزا جلال الدین

بسلسلہ اقبالؒ کے معاصرین

یادداشت مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء

اقبال اور دیگر مشاہیر ہم سے رخصت ہو گئے، مگر ایک بات کا قلق سا ہے کہ ان بزرگوں کی جلوت و خلوت کے جملہ واقعات کما حقہ، قلمبند نہ ہوئے جن سے ان کے روزمرّہ کے حالات اور معاملات سے ان کی زندگی کا صحیح مرقع ہمارے سامنے آجائے اور اس کا ہو بہو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ اس سے بھی زیادہ رنج اس بات کا تھا، جو حضرات اور بزرگ ان مشاہیر کے معاصرین بھی ہیں وہ بھی بصد سرعت ہم سے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اب یہ بات بہت حد تک تشنۂ آرزو رہ جائے گی۔ کہ ہم ان کے چوکھٹے میں ان مشاہیر کو ان کے روزمرّہ کے معمولات میں بحیثیت انسان دیکھ سکیں۔ کچھ ایسے ہی خیالات ایک عرصہ تک میرے ذہن پر مستولی رہے اور بالآخر میں نے ارادہ کیا کہ میں بعض ایسے معاصرین اقبال سے ضرور ملوں جو اَب چراغِ سحری ہیں۔ مگر کسی نہ کسی بہانے میں شمع محفل

تھے۔ اور ان سے ملاقات کے واقعات و تاثرات من وعن بیان کروں ممکن ہے کہ میری ان بے بضاعت مساعی سے ان مشاہیر کے سیرت و کردار پر کچھ مزید حقیقت پسندانہ روشنی پڑ سکے۔ جن کے ساتھ بطور معاصرین ان بزرگوں کو نشست و برخاست کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور وہ ترنگ میں آکر ان کے ماضی کو زندہ کر دیں جو اب رفتہ رفتہ ان کے ہر سانس کے ساتھ مدھم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اقبال کے معاصرین کا سلسلہ تو بہت دراز ہے جو ان کی وفات کے بعد برسوں تک پھیلا رہا ہے۔ مگر اب ان میں سے بیشتر اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اس ضمن میں میں نے بعض بزرگوں سے پے بہ پے ملاقاتیں بھی کیں جن میں ملک حبیب احمد خان صاحب (پدر بزرگوار ملک حسیب احمد خاں صاحب) کے بارے میں قبل ازیں میں بیان کر چکا ہوں۔ اب میں نے مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لاء کی جستجو کی، جو ئندہ یا ئندہ۔ مولانا صلاح الدین اور استاذی المحترم پروفیسر حمید احمد خاں نے اکثر ان کا تذکرہ مجھ سے کیا تھا، کہ مرزا صاحب موصوف کو علامہ اقبال کے دلی دوست ہونے کا فخر حاصل تھا اور یہ کہ وہ علامہ اقبال کے خلوت و جلوت، کے ہمنشین رہے تھے اور اس طرح ان کی ملاقات یقیناً حضرت علامہ کی زندگی کے بعض انسانی پہلوؤں کو اجاگر کرے گی۔ اس افادیت کے علاوہ میرے دل میں یہ جذبہ بھی موجزن تھا کہ میں اس بزرگ کو جلد از جلد دیکھوں جس نے حضرت علامہ کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرایا۔ میں صحیح طور پر نہیں جانتا تھا کہ مرزا صاحب کی قیام گاہ کہاں ہے، صرف ایمپرس روڈ لاہور یاد تھی۔ ایمپرس روڈ پر جا کر میں نے دو رویہ کوٹھیوں کا جائزہ لیا۔ تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے اپنے رفیق کار شیخ آفتاب احمد صاحب پی سی ایس کی کوٹھی کے بالمقابل ایک کوٹھی پر "مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لاء" کے

نام کی تختی کو آویزاں پایا۔ میں کوٹھی کے صدر دروازہ سے اندر گیا۔ اطلاع پر معلوم ہوا کہ مرزا صاحب گھر پر موجود نہیں بلکہ وہ اپنے عزیز محمود نظامی ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور کے پاس ریڈیو اسٹیشن والی کوٹھی میں گئے ہوئے ہیں۔ میں تشنہ ملاقات تو تھا ہی، اس لئے سیدھا ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ اور وہاں سے جناب محمود نظامی کی معیت میں مرزا صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔

مرزا جلال الدین کوٹھی کے ایک کمرے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ٹانگیں نیچے زمین پر رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے نیلے رنگ کی ایک ٹائی سلیقہ سے باندھی ہوئی تھی۔ سفید پتلون پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں ایک سبک مگر قیمتی بوٹ تھا اور نیلے رنگ کی جرابیں پہن رکھی تھیں۔ وہ نحیف الجثہ تھے۔ بدن اکہرا اور قد میانہ تھا۔ آنکھوں میں چمک نہ تھی۔ جس سے ضعف بصارت کا اندیشہ دل میں گزرنے لگا تھا۔ انہوں نے شیو کر رکھا تھا۔ اور مونچھیں سلیقہ سے تراشی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں "پاکستان ٹائمز" اخبار تھا۔ اور وہ اس پر جھکے ہوئے اسے پڑھ رہے تھے۔ "یہ میرے دوست ہیں۔ ابا جان، چودھری غلام رسول ازہر مجسٹریٹ یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" نظامی صاحب کی آواز سن کر مرزا صاحب نے سر اٹھایا۔ ان کو اور مجھے دیکھ کر وہ متبسم ہوئے اور انہوں نے تپاک سے ذرا اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پھر محبت سے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بٹھایا۔ جب میں بیٹھ گیا تو نظامی صاحب جو ریڈیو اسٹیشن جانے کو تیار ہو چکے تھے، اور محض میری وجہ سے رک گئے تھے۔ وہاں سے اجازت لے کر رخصت ہوئے۔

مرزا جلال الدین صاحب نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔ قریب ہی ایک انگریزی

کی کتاب مؤلفہ ہڈسن بستر پر پڑی تھی۔ اسے پرے ہٹایا۔ مجھ سے میری خیریت دریافت کی اور فرمایا، آپ مجسٹریٹ ہیں، میں نے ابتدائی ایام کچھ عرصہ ضلع کچہری لاہور میں پریکٹس کی تھی۔ آپ کو دیکھ کر وہ زمانہ یاد آگیا۔ ضلع میں پریکٹس کرنا ضروری بھی ہے۔ اور مفید بھی کہ اصل کام تو ضلع کی عدالتیں ہی سرانجام دیتی ہیں۔ ان کا کام CONSTRUCTION کا ہے۔ وہ ضابطہ کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ گواہوں کو سنتے ہیں۔ ان کی شہادت قلمبند کرتے ہیں۔ جرح اور بحث کی سماعت کرتے ہیں اور پھر فیصلہ سناتے ہیں۔ عدالت ہائے اپیل میں تو کام DESTRUCTION کا ہے۔ "یہ شہادت ٹھیک نہیں۔ فلاں گواہ جھوٹا ہے۔ فلاں جگہ قانونی سقم ہے۔" لہٰذا میں اسے کوئی زیادہ مفید کام نہیں سمجھتا۔ بلکہ جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ کام گویا تخریبی نوع کا ہے۔ جب اقبال نے وکالت پاس کی تو انہوں نے ضلع کچہری میں پریکٹس کرنا پسند نہ کیا۔ مگر میں اس بات پر مُصر رہا کہ وکیل کے لئے ضلع کی عدالت ہائے کا تجربہ لازمی ہے۔ تاکہ بعد ازاں عدالت ہائے اپیل میں کام بطریق احسن کیا جا سکے۔ مگر اقبال کی طبیعت ضلع کی پریکٹس کی طرف راغب نہ ہوئی اور انہوں نے براہِ راست ہائی کورٹ میں ہی پریکٹس شروع کی تھی۔ پھر فرمایا: میں ۱۹۰۱ء میں بیرسٹری کے سلسلہ میں ولایت گیا۔ میری میزبان کا مکان GRY'S INN کے قریب تھا۔ میرا آخری یعنی تیسرا سال تھا کہ ہندوستان سے شیخ عبدالقادر کی اطلاع ملی کہ شیخ محمد اقبال بیرسٹری کے سلسلہ میں ولایت آرہے ہیں۔ اقبال ۱۹۰۵ء میں ولایت پہنچے۔ میں ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری سے فارغ ہو چکا تھا۔ پھر فرمایا شیخ عبدالقادر بیحد ہر دلعزیز تھے۔ ولایت جانے سے قبل وہ OBSERVER اور مخزن کے ایڈیٹر تھے اور اس بنا پر علمی حلقوں میں ان کی بہت شہرت تھی۔ جب وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس وطن آئے

تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر ان کا ایسا شاندار استقبال ہوا کہ آج تک میرے دل میں اس کی یاد تازہ ہے۔ جن دنوں شیخ عبدالقادر ولایت سے لوٹے تو گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں کوئی تقریب تھی۔ ڈنر میں میں شیخ عبدالقادر اور میاں محمد شفیع بھی شریک تھے شیخ عبدالقادر کے شاندار استقبال کا اس قدر چرچا تھا کہ لاہور چیف کورٹ کے چیف جج غالباً (مسٹر کلارک) نے مجھ سے دریافت کیا کہ چند روز ہوئے ولایت سے کون لوٹا ہے جس کا لاہور ریلوے اسٹیشن پر اس قدر شاندار استقبال ہوا۔ جس پر میں نے ان سے کہا کہ وہ ان کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ مسٹر کلارک نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے شیخ عبدالقادر جو میرے قریب ہی اس دعوت میں موجود تھے۔ ان کو مسٹر کلارک سے یہ کہہ کر متعارف کرایا کہ "یہ میرے دوست شیخ عبدالقادر ہیں جو چند روز ہوئے ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس آئے ہیں"۔ شیخ عبدالقادر بعد ازاں سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کے ممبر ہو گئے۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں دو ممبر تھے۔ ایک شیخ صاحب اور ایک سکھ، جو راولپنڈی کے ایک متمول زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ دونوں ممبر ولایت ہی میں رہتے تھے۔ میں اس زمانے میں ریاست بہاولپور کے نواب صاحب کا مشیر قانون تھا۔ اور ان کے ایک کام کے سلسلے میں ولایت گیا ہوا تھا۔ شیخ عبدالقادر وہاں YOUNG INDIAN SPEAKERS' LEAGUE کے صدر تھے۔ ان دنوں ہندی، اردو کا تخانۂ عہ ہندوستان میں زوروں پر تھا۔ یہاں تک کہ ولایت میں مقیم ہندوستانی بھی اس سے متاثر تھے۔ وہاں ایک مشاعرہ تھا جس کی صدارت شیخ عبدالقادر نے کی۔ میں شعر خال ہی کہتا تھا۔ مگر شیخ صاحب کا اصرار تھا کہ میں بھی اس مشاعرہ میں کچھ لکھ کر لاؤں۔ میں نے ان کے اصرار کے پیش نظر ایک نظم پڑھی جس کے کچھ اشعار مجھے اب تک یاد ہیں۔

جو زبانوں کا تنازع ہند میں برپا ہے آج
فکر قادر نے مہیا کر دیا اس کا علاج
قوم تب بنتی ہے جب اس کی زباں بھی ایک ہو
سود اس کا ایک ہو اس کا زیاں بھی ایک ہو

اقبال ۱۹۰۵ء میں ولایت گئے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں ۱۹۰۶ء میں قانون کی تعلیم سے فارغ ہو کر ہندوستان آ گیا تھا۔ جانے سے قبل شیخ عبدالقادر کے توسط سے اقبال میرے پاس ولایت کے کوائف معلوم کرنے آئے۔ میں نے ان کو ضروری تفاصیل سے آگاہ کیا۔ وہ دو بار مجھ سے ملے اور بعض دیگر جزئیات معلوم کیں۔ میں اس زمانے میں اقبال کو بطور ایک شاعر ہی جانتا تھا۔ ولایت سے واپسی پر میرے ان کے تعلقات بڑھے، پھر بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ موت نے مجھ سے "میرا اقبال" چھین لیا۔ اب میرا وقت بھی قریب ہے میں جلد اقبال اور ذوالفقار سے جا ملوں گا۔ مجھے موت کے خیال سے ایک گونہ راحت ہوتی ہے، وحشت نہیں۔

اقبال و ذوالفقار کا ملنا قریب ہے
رخت سفر باندھے ہوئے یہ غریب ہے
دنیائے دوں کو چھوڑنے کا غم اسے ہو کیوں!
جو دوستوں سے جا ملے وہ خوش نصیب ہے

اس مرحلہ پر میں نے مرزا صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتے دیکھی جیسے وہ اقبال اور نواب ذوالفقار علی کو اپنے سامنے کھڑے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے ہوں۔ پھر فرمایا: میں نے اقبال کو اکثر خواب میں دیکھا ہے۔ وہ مجھے لمحہ بھر کے لئے بھی فراموش نہیں ہوئے۔

محترمہ مِس فاطمہ جناح

اقبالؒ سے میری آخری مُلاقات

محترمہ فاطمہ جناح یوم اقبال کے سلسلے میں آج کل لاہور تشریف لائی ہوئی ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو قدرتاً علامہ اقبال مرحوم و مغفور کا ذکر شروع ہو گیا۔ آپ نے بڑے تاثر انگیز لہجے میں مجھ سے علامہ مرحوم سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر فرمایا۔ جسے میں نے اسی وقت آفاق کے لئے قلم بند کر لیا۔ (محمد شفیع)

میں ۱۹۳۷ء میں قائدِ اعظم کے ہمراہ آئی، تو قائدِ اعظم کے پروگرام میں اقبال سے ملاقات بھی شامل تھی۔ میں نے اس سے پہلے اقبال کو لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا، جب قائدِ اعظم اقبال سے ملنے کے لئے جانے لگے تو میں نے بھی اقبال سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

جب ہم دونوں بھائی بہن جاوید منزل پہنچے تو دیکھا، اقبال چارپائی ڈالے برآمدے میں ایک بڑے تکیئے پر سر نہیوڑائے اکڑوں بیٹھے تھے، انہیں پہلے صرف

یہی معلوم تھا کہ قائدِ اعظم ملاقات کے لئے آئے ہیں، اسی لئے وہ اُسی بے پروائی کے انداز میں بیٹھے رہے، لیکن انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں تو انہوں نے تکلف برتنے کی ایک کوشش کی اور لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اور اپنے ملازم سے فرمایا کہ جاوید اور منیرہ کو بُلا لاؤ۔

ہم دونوں بہن بھائی بید کی کُرسیوں پر ان کے سامنے بیٹھ گئے، اور اقبال پھر اسی بے تکلف انداز میں سر کو تکیئے سے لگا کر خاموش سے بیٹھ گئے، غالباً اس وقت ان کی طبیعت خاصی ناساز تھی۔ ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی، ان کا جسم نحیف و نزار نظر آرہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر جلال چمک رہا تھا۔

اس اثناء میں منیرہ اور جاوید بھی آگئے۔ منیرہ گڑیا کے مانند بالکل معصوم بچی تھی۔ جاوید کی عمر بھی کوئی سات آٹھ سال ہو گی۔ میں نے منیرہ کو پیار کیا تو اقبال کہنے لگے، "بچوں کا چھوٹی عمر میں مادری پیار سے محروم رہ جانا بہت دردناک بات ہے، میں بوڑھا ہو چکا ہوں، ان کی غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت میرے لئے ایک بڑا بھاری مسئلہ ہے۔ ولایت میں ایسی درسگاہیں ہیں جہاں بچوں کو والدین پورے اطمینان کے ساتھ بھیج سکتے ہیں، یہاں پر ایسا کوئی انتظام نہیں۔"

اس پر میں نے تسلی کے چند کلمات کہے، جس پر انہوں نے فرمایا "ہاں —— دراصل تو خدا ہی ہے جو مستقبل کا نگہبان ہے۔"

پھر قائدِ اعظم اور اقبال میں سیاسیات پر گفتگو ہوتی رہی، میں نے دیکھا کہ اقبال کی نگاہوں پر مسائل کے سب گوشے بے نقاب تھے۔

ان کی صحت کے پیشِ نظر ہم نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے رخصت لے کر ہم چلے آئے۔

پچھلے دنوں میں جب جاوید منزل میں گئی تو مجھے یہ جان کر بے حد مسرّت ہوئی کہ جاوید کو یہ سارا واقعہ یاد ہے۔

فیض احمد فیضؔ

اقبالؔ اپنی نظر میں

اقبال کی نظر سے دنیا کو بہت لوگوں نے دیکھا ہے۔ اقبال کی نظر سے اقبال کا مطالعہ کسی نے نہیں کیا۔ یہ مضمون اسی بحث کا حرفِ آغاز ہے۔ یہ بحث دو وجہ سے اہم ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ استحکام خودی، عقل و عشق، خدا اور انسان اور ایسے ہی دوسرے فلسفیانہ موضوعات کی طرح اقبال کی ذات بھی مرحوم شاعر کا ایک مستقل موضوع ہے۔ اور ان کے کلام کا کوئی دور ایسا نہیں جو اس موضوع سے عاری ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میری رائے میں کلام اقبال کا سب سے پرخلوص، سب سے دلگداز، سب سے رسیلا جزو وہی ہے جو ان کی اپنی ذات سے متعلق ہے۔ یہ حصہ فلسفہ سے عاری لیکن جذبہ سے بھرپور ہے۔ اس میں خطابت کا جوش ناپید لیکن احساس کی شدت فراواں ہے۔ اس کلام پر اقبال کی حکیمانہ بزرگی کا انحصار بہت کم ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا انحصار بہت زیادہ۔

اقبال مرحوم کے فلسفیانہ نظریات کا ارتقاء تدریجی ہے انقلابی نہیں ہے ۔ ان کے ابتدائی اور آخری افکار و خیالات میں ایک داخلی رابطہ اور تسلسل ہے جو ٹوٹنے نہیں پاتا۔ مختلف اوقات پہ مرحوم شاعر نے جن نظریات کی تفسیر اور تشریح کی ہے، ان میں اختلاف تو ہے تناقض نہیں ہے۔ اقبال نے اپنی ذات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ ابتدائی کلام میں جن جن ذہنی الجھنوں اور جذباتی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، جن کلفتوں اور مسرّتوں، جس کرب یا سرور کا اظہار کرتے ہیں۔ بعد کے کلام میں انہی کیفیات کی بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے۔ اگر ہم اقبال کی نظر سے اقبال کی ذات کو دیکھیں تو ہمیں اس شخصیت کے چند ایک پہلو بہت نمایاں نظر آئیں گے۔

پہلی بات جو ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال اپنی ذات کو دنیا و ما فیہا سے الگ تھلگ ایک قطعی خود مختار اور مطلق العنان حقیقت قرار دے کر اپنے دل و دماغ کا تجزیہ نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی ذات کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں بیشتر کسی اور خارجی حقیقت سے کہتے ہیں یوں کہہ لیجئے کہ اپنی ذات کے متعلق ان کا بیان بیشتر اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں بیشتر اس تسکین یا اضطراب کا تذکرہ ہوتا ہے۔ جو شاعر کی ذات اور کسی اور شے کے باہمی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اور "شے" کبھی مناظر فطرت ہیں تو کبھی ابنائے روزگار، کبھی خاکِ وطن ہے تو کبھی ریگزارِ حجاز کبھی کوئی فنّی یا جذباتی یا اخلاقی نصب العین ہے کبھی خودی کا کوئی بلند تر مقام، کبھی خالق مسجود، اقبال کو اپنی ذات سے اگر دلچسپی ہے تو وہ داخلیت پسند اور جذبات پرست شعراء کی طرح محض اپنی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس نفع و ضرر کی وجہ سے

جو اس ذات سے دنیا و ماورا کے لئے اور دنیا و ماورا سے اس ذات کے لئے مرتب ہوتے ہیں۔

اب یہ دیکھئے کہ اقبال نے مختلف اوقات میں اپنی ذات کے متعلق کیا کچھ محسوس کیا ہے۔ بانگِ درا کی دوسری نظم میں اقبال گلِ رنگیں سے مخاطب ہو کے فرماتے ہیں:

اس چمن میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور میری زندگانی بے گدازِ آرزو
مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں مَیں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجُو رہتا ہوں مَیں

یہ پریشانی اور اضطراب، یہ مسلسل جستجو اور آرزو مندی اقبال کی شاعرانہ شخصیت کا جزوِ اعظم ہے۔ اس اضطراب کے اسباب اور اس جستجو کے مقاصد بدلتے رہے۔ لیکن ان کیفیات کا احساس اقبال کے سارے کلام پر طاری ہے۔ اور وہ اس کا اظہار مختلف پیرایوں میں کرتے ہیں۔ اقبال جب بھی مظاہرِ فطرت کی خنک آسودگی اور بے حس سکون کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں ہمیشہ اپنے دل کو تڑپ اور اپنے جذبات کو ناآسودگی کا شدّت سے احساس ہوتا ہے۔

تاروں کا خموش کارواں ہے — یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا — قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں لے کے غم کو سو جا
سورج بنتا ہے تارِ زر سے — دنیا کے لئے ردائے نوری

ہر یکے مانندِ ما بیچارہ ایست — در فضائے نیلگوں آوارہ ایست
ایں جہاں صیداست وصیاد یم ما — یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما

زار نالیدم صدائے برنخواست
ہم نفس فرزندِ آدم را کجا است

یہ مضطرب اور پُرسوز شخصیت جو اپنے اضطراب اور سوز و گداز کی وجہ سے مہ و مہر کی دنیا میں اپنے کو اجنبی اور تنہا محسوس کرتی ہے۔ انسانوں کی دنیا میں بھی اسی طرح اجنبی اور تنہا ہے۔ اقبال کی نظر میں ان کا ہمعصر انسان بھی نباتات اور جمادات کی طرح مُردہ دل اور بے سوز ہے۔ اس لئے وہ اس انسان سے بھی اپنے کو اتنا ہی دُور پاتے ہیں جتنا چاند ستاروں سے

یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی
مری مثال ہے طفلِ صغیرِ تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

ہنوز ہم نفسے در چمن نمی بینم
بہار می رسد و من گل نخستینم

جہاں تہی ز دل و مشتِ خاک من ہمہ دل
چمن خوش است دلے در خورِ نوایم نیست

سوز اور تنہائی کا یہ احساس سینہ میں دبائے شاعر سکون اور رفاقت کی تلاش میں جگہ جگہ اور کو بکو سر بگرداں پھرتا ہے۔ لیکن یہ دولت نہ حرم و دیر میں میسّر ہے نہ مدرسہ و خانقاہ میں، مسجدیں بھی اس سے خالی ہیں میکدے بھی۔

نہ ایں جا چشمکِ ساقی نہ آنجا حرفِ مشتاقی
ز بزمِ صوفی و ملّا بسے غم ناک می آیم
ہوائے خانہ و منزل ندارم
سر راہم غریبِ ہر دیارم
اٹھا ہیں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبّت، نہ معرفت، نہ نگاہ

اس مسلسل اور بے پایاں تنہائی کی وجہ سے رجائیت اور خود اعتمادی کے سب سے بڑے ترجمان کو آہستہ آہستہ ذاتی شکست اور ناکامی کا گہرا اور پُر درد احساس ہونے لگتا ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ اس احساس کی شدّت کم ہونے کی بجائے بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اس شکست کو اقبال کبھی ناسازیٔ زمانہ پہ محمول کرتے ہیں۔

بخاک ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

کس نداست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دست زدِ بے اجراں

لیکن بیشتر اس شکست کا احساس اقبال کو اس وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ وہ حصول منزل میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ نہ وہ خرد کی گتھیاں سُلجھا سکے ہیں۔ نہ عشق کا مقامِ محمود انہیں ہاتھ آیا ہے۔ ان کی بیقرار خودی کا اس حقیقت سے وصال نہیں ہو سکا۔ جس کا وصال خودی کی تکمیل اور تسکین کا ضامن ہے۔ فن کی انتہا بھی خودی کی اس تشنگی کو نہیں مٹا سکی اور اس تشنگی کے باعث اظہار میں کامیابی کامیاب تبلیغ کا درجہ حاصل نہیں کر سکی۔

وہی میری کم نصیبی وہی میری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا۔ یہ کمال نے نوازی
اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

تھی وہ اک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیل کارواں سمجھا تھا میں

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس احساسِ شکست کی وجہ سے اقبال اپنی جدوجہد کو لاحاصل تصور کرتے ہیں یا اپنے ماحول سے مایوس اور بیزار ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں حزن اور اداسی تو ہے۔ یاس اور قنوطیت کہیں

نہیں ہے۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

چنانچہ مرحوم شاعر کو اگر کم نصیبی کا گلہ ہے تو کمالِ نے نوازی کا غرّہ بھی ہے۔ اس کی طبیعت میں حلم اور انکسار بھی ہے۔ غرور اور تمکنت بھی۔ اس غرور اور تمکنت کی دو صورتیں ہیں۔ اس کی فقر اور قناعت اور عزلت نشینی ہے۔ ایسا فقر جو اپنی بے سامانی پہ نازاں اور اپنی کم آمیزی پہ شاداں ہے۔ یہ مستغنی فقر بھی اقبال کے محبوب ترین مضامین میں سے ہے۔

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

فقیہِ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال
گدائے رہ نشیں است و دل غنی دارد

خواجۂ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نہ کند پیالہ را

اس کو دوسری صورت میں اس اعجاز کا احساس ہے جو شاعر کے نطق و قلم کو بخشا گیا ہے۔ ایسا اعجاز جس کے سامنے دولت پرویز، ہیچ اور سطوتِ قیصر سرنگوں۔

دم مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند
گیاہ راز سرشکم چو یاسمیں کردند

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں
ہزار بار مرا نوریاں نمیں کردند
مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیلِ آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے
فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

جس طرح اقبال کا انکسار یاس انگیز نہیں اسی طرح ان کے غرور میں بھی خودسری اور درشتی نہیں ہے۔ اپنی غریب قوم کے عام افراد اور خاص طور سے نوجوانوں کو اقبال جب بھی خطاب کرتے ہیں تو ان کی ذات کا ایک اور جذباتی پہلو واضح ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ایک بہت ہی پُرخلوص اور مشفقانہ پیار کا جذبہ ہے جو ہمارے خود پسند شعر میں بمشکل مفقود ہے۔

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری — اُمیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینہ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہم ہیں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

غرض اقبال کے کلام سے شاعر کی جو تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں فراق نصیب عاشق کا سا سوز و ساز اور حسرت ہے۔ پادشاہ کا سا غرور، گدا کا سا حلم، صوفی کا سا استغنا، بھائی کی سی محبت اور ندیم کی سی مودت۔

امروز ۲۲ اپریل ۱۹۴۶ء

سیّد محسن شاہ

اقبالؒ کی باتیں

۱۹۰۸ء میں مسلمانانِ لاہور نے جن کے بزرگ کشمیر سے آئے تھے اور جن کو اہلِ خطہ کہا جاتا تھا ایک انجمن بنام "مسلم کشمیری انجمن" قائم کی جس کا مقصد مسلمانانِ کشمیر کی تعلیمی، سیاسی اور تمدّنی بیداری میں حصّہ لینا تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال اس انجمن کے سیکرٹری مقرر ہوئے مگر کچھ عرصہ کے بعد ان کی رائے میں مسلمانانِ کشمیر کے متعلق تمام مسلمانوں کو مِل کر جد وجہد کرنی چاہیئے اس لئے وہ انجمن کشمیری مسلمانان سے مستعفی ہو گئے اور ان کی یہ رائے بھی تھی کہ ایک فرقہ کی انجمن کا قیام دوسری برادریوں کو اپنی اپنی انجمنیں قائم کرنے کی ترغیب دے گا اور اس طرح وحدتِ اسلام میں فرق آجائے گا۔ چنانچہ انجمن کشمیری مسلمانان کی تقلید میں ارائیوں، جاٹوں، کمبوہوں، راجپوتوں، لگے زئیوں نے اپنی اپنی برادری کی الگ الگ انجمنیں قائم کرلیں۔

اگرچہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے عملی طور پر کشمیری انجمن میں حصہ نہیں لیا۔ مگر جب میں آل انڈیا کشمیر مسلم کانفرنس کا سیکرٹری مقرر ہوا تو وہ مجھے ہمیشہ مفید مشورے دیتے رہے اور مسلمانانِ کشمیر کے سیاسی اور تعلیمی معاملات میں ہر قسم کی اعانت فرماتے رہے اور جب کشمیر میں مہاراجہ نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تو مسلمانانِ پنجاب نے کشمیر کمیٹی مقرر کی جس کے صدر ڈاکٹر محمد اقبالؒ تھے۔ اس کمیٹی نے حکومت برطانیہ اور گورنر جنرل ہند کو کشمیر کے حالات سے آگاہ کر کے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ کشمیر میں اصلاحات کرے۔ چنانچہ گلیسنی کمیشن اس غرض کے لئے حکومت کی طرف سے مقرر ہوا جس نے چند اصلاحات رائج کیں۔ گو ان اصلاحات میں ریاست کے حکام کا کافی ہاتھ تھا، تاہم عوام کو کچھ نہ کچھ اختیارات تفویض ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر علامہ اقبال اس وقت زندہ ہوتے تو کشمیر کی موجودہ سیاسی صورت مختلف ہوتی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی دُور بین نظر ان تمام واقعات کا جائزہ لیتی جن کی وجہ سے موجودہ صورت پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ شعر کہ :-

"دُرِّ مطلب ہے اخوّت کے صدف میں پنہاں
مِل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر"

اب بھی ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہے اگر ہم اس پر عمل کریں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال انجمن اسلامیہ کے بھی صدر رہے اور میں انجمن کا سیکرٹری تھا سنہ ۱۹۳۳ء میں سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب مقرر ہوئے تو انجمن اسلامیہ نے ان کے تقرر پر سر محمد اقبالؒ کی سرکردگی میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس میں مسجد شاہ چراغ کی واگذاری اور شاہی مسجد کی مرمت اور بحالی کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔

گورنر نے ان مطالبات کا ہمدردانہ جواب دیا۔ مسجد شاہ چراغ تو علامہ کی زندگی میں ہی انجمن کی تولیت میں آگئی۔ مگر مسجد شاہی کی مرمت اور بحالی اُن کی وفات کے بعد شروع ہوئی اور اب جاکر مکمل ہوئی ہے مگر اس کی بنیاد اس سپاسنامہ کے جواب میں موجود تھی جو انجمن کی طرف سے پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب انجمن حمایت اسلام کے بھی صدر تھے ان کی صدارت کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ان کے زمانہ میں ہی احمدیہ اور قادیانی فرقوں کے اصحاب کو انجمن کی کارکن جماعتوں میں شریک ہونے سے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ آج تک اس جماعت کا کوئی فرد انجمن کی انتظامی جماعت کا رکن نہیں۔

تقریباً پچاس سال سے زائد عرصہ گذرا کہ لاہور میں ایک جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال میں زیرِ سرپرستی ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن منعقد ہوا جس کی صدارت میاں سر محمد شفیع صاحب فرما رہے تھے اس جلسہ میں کسی صاحب نے حب الوطنی کو بڑا خراج تحسین پیش کیا مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے تمام ملک جہاں جہاں وہ رہتے ہیں ان کا وطن ہے اور ان کی رائے میں حبِ وطن دینی وحدت کو پارہ پارہ کردیتی ہے اس سے لادینی اور دہریت کا چرچا ہوتا ہے اور مذہبی روح فنا ہوجاتی ہے، ہر قوم ہر ملک کا وطن علیحدہ قرار دئے جانے پر اقتصادی مخالفت شروع ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اگر وکالت میں ہمہ وقت مصروف رہتے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ چوٹی کے وکلاء میں شمار ہوتے اور ہائی کورٹ کی ججی سے ریٹائر ہوتے مگر مسلمانانِ عالم کی خوش نصیبی تھی کہ ایسا نہ ہوا کیونکہ مشیت ایزدی نے مسلمانانِ عالم کو بیدار کرنے کا کام ان کے سپرد کیا تھا جب انہوں نے

اپنے حریت آموز اور پُرجوش کلام سے عوام الناس اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنا پیغام سنانا شروع کیا تو زبانِ خلق نے انہیں ترجمانِ حقیقت حکیم الامّت شاعرِ اسلام شاعرِ مشرق کا خطاب دیا۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں آپ کی یہ عالمگیر عزّت اور شہرت دیکھ کر جو ہندوستان سے باہر یورپ امریکہ اور تمام ممالک اسلامیہ میں آپ کی مثنویوں کے ترجمہ کے ذریعہ حاصل ہوئی آپ کو ناٹ کا معزز خطاب عطا کیا گیا۔ اس خوشی میں مقبرہ جہانگیر میں جو جلسہ ہوا اس میں ہندو اور مسلمان معززین کے علاوہ سر البرٹ میکلیگن گورنر بھی شریک ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی پرائیویٹ زندگی نہایت سادہ تھی وہ SIMPLELIVING AND HIGHTHINKING کے اصول پر پوری طرح عمل پیرا تھے اور تمام دوست جو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ان سے بے تکلف باتیں کرتے بلا روک ٹوک ہر ایک ان کی ملاقات سے فیض یاب ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کفایت شعاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں جب ڈاکٹر صاحب کی وفات ہوئی تو مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک مرحوم میرے پاس آئے تو مجھ سے کہا کہ میں بحیثیت سیکرٹری انجمن اسلامیہ پنجاب ڈاکٹر صاحب کی قبر شاہی مسجد کے قریب بنانے کی اجازت حکومت سے حاصل کرنے میں مدد دوں۔ چنانچہ ایک مختصر سا وفد صوبائی گورنر کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے محکمہ آثار قدیمہ سے مشورہ کر کے یہاں قبر بنانے کی اجازت دے دی۔

ہائی کورٹ بار میں ڈاکٹر صاحب جب کبھی آتے تو تمام ممبران باران کی میز پر

آجاتے اور وہ ان کی باتوں سے بہت محظوظ ہوتے۔ وہ بالعموم اس میز کے گرد جہاں اب قریبی دیوار پر ان کی تصویر آویزاں ہے بیٹھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں عام موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ شعر و شاعری کے علاوہ بھی مختلف امور پر حضرت علامہ بڑی پُرلطف باتیں کرتے تھے۔ اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی وہ بھولی بسری باتیں یاد آتی ہیں تو ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی عظیم شخصیت کے بعض پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

علامہ اقبالؒ سے ایک مُلاقات

۱۹۳۶ء کا ذکر ہے میں کیمرج سے لاہور پہنچا اور سیدھا جاوید منزل کے آستانے پر حاضر ہوا۔ علامہ اقبال گھر پہ موجود نہ تھے۔ میں حسب دستور بے اطلاع گیا تھا۔ اور کسی کا گھر پہ موجود نہ ہونا حیرت ناک امر تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان سے الوداع کہہ کر گیا تھا۔ اس عرصے میں یہ کیا انقلاب آیا کہ علامہ گھر سے باہر ہوں۔ ملازم سے پوچھا کہنے لگا کہ سیر کو گئے ہیں۔ یہ بہت ہی تعجب خیز بات تھی۔ باہر گئے بھی تو سیر کے لئے۔

علامہ اقبال کی سیر کا مجھے تجربہ تھا۔ اسلامیہ کالج میں انگریزی پڑھایا کرتا تھا۔ فارغ ہو کر میکلوڈ روڈ پہنچا۔ علامہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "تاثیر صاحب، آپ کبھی سیر بھی کیا کرتے ہیں، لوگ کہتے ہیں صحت کے لئے سیر کرنا اچھا ہے۔" میں مطلب سمجھ گیا۔ میں نے کہا "جی ہاں اگر آپ کا ارادہ ہو تو سیر کی جائے۔" کہنے لگے مگر آج نہیں۔ کل باقاعدہ نیت باندھ کر یہ کام کیا جائے۔

نیت کے بغیر تو نماز بھی نہیں ہوتی ۔ نیت باندھنے میں بڑا نفسیاتی نکتہ ہے۔ اس سے توجہ مرکوز ہوتی ہے اور نتائج جلد مرتب ہوتے ہیں! دوسرے دِن میں وقت مقررہ پر حاضر ہوا۔ چہل قدمی ہوئی ۔ چالیس سے کچھ زیادہ قدم ہی چلے اور واپس آکر مستقبل کے لئے باقاعدہ پروگرام بھی مرتب ہوا لیکن تیسرے دن سیر کی نوبت نہ آئی ۔ لوگ آگئے ۔ یا کچھ اور بات ہوگئی ۔

ان دِنوں علامہ کی صحت اچھی بھلی تھی ۔ نقرس کے علاوہ کوئی خاص عارضہ نہ تھا۔ لیکن جاوید منزل میں عوارض کے باوجود سیر کے لئے نکلنا مجھے بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔

ملازم سے پوچھا کہ کب گئے تھے کہنے لگا کہ دس منٹ ہوئے ہوں گے۔ اور مجھے یاسِ سا دیکھ کر کہنے لگا ۔ کہ دس بارہ منٹ میں آجائیں گے۔ موٹر پر گئے ہیں ۔ میں ہنسنے لگا چہل قدمی بھی نہ تھی ۔ ہوا خوری تھی ۔ ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر آگئی ۔ وہ موٹر سے نکل کر میرے برابر سے ہو کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے ۔ مجھ سے بات بھی نہ کی ۔ میں برآمدے میں "کھڑے کا کھڑا" رہ گیا ۔ دو منٹ کے بعد ننگے پاؤں باہر نکل آئے اور آبدیدہ ہو کر گلے لگا لیا ۔ کہنے لگے "دیکھا اب میری آنکھ کام نہیں کرتی ۔ مجھے تو بارہا خیال گزرا کرتا تھا کہ جیتے جی ملاقات نہ ہوگی ۔"

کمرے میں بیٹھے تو آپ نے پہلا سوال یہ کیا "کہو شادی کر آئے ہو ۔"

میں نے جواب میں ذرا تامل کیا تو انگریزی میں کہنے لگے ۔ "جاؤ واپس جاؤ اور شادی کر کے آؤ" (اردو میں) میں تمہیں تمہارے بچپن سے جانتا ہوں (انگریزی میں) تم یہاں کبھی خوش نہیں رہو گے ، جاؤ شادی کر کے آؤ ۔"

میں نے مسکرا کر کہا ۔ "آپ تو اہلِ فرنگ اور فرنگ کی مذمت کرتے رہے ہیں ۔ مجھے

وہاں شادی کے لئے کہتے ہیں۔"

کہنے لگے "تم بھی یوں کہتے ہو۔ تم جانتے ہو میں فرنگ کی کس بات کی مذمت کرتا ہوں۔" اور سبا بہ اٹھا کر اپنا ایک مصرعہ پڑھا۔" افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند۔"

میں نے کہا کہ منگنی کر آیا ہوں۔ پانچ چھ مہینے الگ رہ کر دیکھتے ہیں اگر لاچار ہو گئے تو شادی کریں گے۔

ہنسنے لگے۔" میں جانتا تھا تم شادی کر کے آؤ گے۔ وہ جرمن لڑکی کا واقعہ تمہیں یاد ہے۔ میں نے کئی لوگوں کو تمہارا فقرہ سُنایا ہے۔"

یہ واقعہ یوں تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب، گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو مجھے کہنے لگے کہ تمہارے لئے ایک لڑکی پسند کر آئے ہیں۔ جرمن ہے اور مجھے جرمن لڑکیاں خانہ داری کی وجہ سے پسند ہیں۔ انگریزی فرانسیسی اور ہسپانوی زبان خوب جانتی ہے۔ نہایت خوش شکل ہے۔ امومت صفت ہے۔ تم جانتے ہو عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں، امومت صفت اور معشوق صفت۔ ہندوؤں کے کوک شاستر میں کئی قسمیں ہیں، لیکن کرداری صفات کے اعتبار سے یہی دو قسمیں واضح ہیں۔ میں نے تمہارے ایک دو جاننے والوں سے بھی پوچھا تھا سب مجھ سے متفق تھے کہ تاثیر کے لئے نہایت مناسب ہے۔ میں اسے کہہ آیا ہوں وہ یہاں آجائے گی۔

میں نے عرض کیا کہ اگر ایسی ہی نادیدہ شادی ہوتی ہے تو مشرق نے کیا قصور کیا ہے۔ یہیں شادی کیوں نہ کر لیتا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب خوب ہنسے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اب شادی کا مرحلہ دوبارہ درپیش ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ نکاح نامہ میں خود تیار کروں گا۔ اسلامی قانون کے جملہ امکانات کو استعمال کر کے اس طرح بناؤں گا کہ ایک مثال کا کام دے۔ عورت کے وہ تمام حقوق جو ہندی رسوم اور دیگر موانعات کی وجہ سے کالعدم ہو گئے ہیں ان کی تجدید کی جائے گی۔ یہ نکاح نامہ تم ولایت بھیجو تاکہ لڑکی خود دیکھ لے۔ وکیلوں کو دکھالے اور اطمینان کے بعد اس کی توثیق کی جائے۔ نکاح بھی میں خود پڑھوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اسلامی قانون کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے وکیل احباب سے بھی مشورہ کیا۔ بالخصوص غلام رسول بیرسٹر ایٹ لاء سے اور تین مہینے کی محنت کے بعد مسودہ تیار ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اگر چاہو تو کبھی اس نکاح نامے کو شائع کر دینا تاکہ دوسروں کے کام آئے۔ میں نے اس دستاویز کو رجسٹر بھی کرا لیا تاکہ تلف نہ ہو جائے۔ جب آپ نکاح کی رسم کے لئے بارہ دری خانے پہنچے تو آپ علالت کی وجہ سے ایسے نحیف ہو چکے تھے کہ سہارے ہاں پہنچ کر بے ہوش ہو گئے۔ مگر نکاح خود پڑھایا۔

لڑکی سے پوچھا کہ کیا آپ پہلے سے مسلمان ہیں یا اب مسلمان ہوئی ہیں ساتھ ہی یہ کہا کہ اسلام میں عیسائی سے شادی مذہب تبدیل کئے بغیر بھی ہو سکتی ہے جب اُس نے کہا کہ میں پہلے سے مسلمان ہوں تو فرمایا کہ میں مولوی یا پادری نہیں۔ اسلام میں پادری وغیرہ نہیں ہوتے۔ نکاح کے لئے کسی ملا پادری کی ضرورت نہیں۔ یہ دو شخصوں کا ایجاب و قبول ہے میں اس عہدنامے کا گواہ ہوں اور بس۔

جس ملاقات کا میں ذکر کر رہا تھا اس میں فقط شادی کی بات نہ ہوئی تھی۔ لیکن اُس کی اہمیت اور ذاتی لذت کی وجہ سے میں نے زیادہ شرح و بسط سے کام لیا ہے۔

ایک اور بات جو قابلِ ذکر ہوئی اس کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے اور علامہ اقبال کی اپنی ذات سے بھی۔ ڈاکٹر صاحب کو اوکسفورڈ سے روڈز لیکچر دینے کی دعوت آئی۔ میں ان دنوں کیمرج میں تھا اور ڈاکٹر صاحب کو اصرار سے لکھا کہ وہ اس دعوت کو رد نہ فرمائیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کا سفر انگلستان سیاسی حیثیت رکھتا تھا۔ روڈز لیکچر کی علمی حیثیت تھی۔ انگلستان کے ادیب اور اہلِ علم لوگوں کو ان کا صحیح مقام معلوم ہو گا۔ ڈاکٹر صاحب نے زمان و مکان کے اسلامی تصور پر لیکچر دینے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے انگلستان کے ادبی حلقوں میں ان لیکچروں کا پہلے سے چرچا کر رکھا تھا۔ ذاتی اور قومی فخر کے ساتھ اقبال کے ادبی مرتبے کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں یقین دلایا کہ میں ضرور آؤں گا لیکن یکایک ان کا ایک اور خط آیا اس میں لکھا کہ انہوں نے ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔ مجھے اس کا بہت رنج ہوا اور برخوردارانہ گستاخی کے ساتھ انہیں ایک تند قسم کا خط لکھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ والدۂ جاوید نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ بچوں کو اکیلا نہ چھوڑنا اس لئے انگلستان نہیں جا سکتا۔ میں نے اسے عذرِ لنگ قرار دیا تو آپ نے کہا کہ ایک اور راز بھی ہے۔ وطن واپس آؤ گے تو بتاؤں گا۔

اس ملاقات میں وہ راز بھی منکشف ہوا۔ روڈز لیکچر کی دعوت لارڈ لوتھین کے ذریعے آئی تھی۔ لارڈ لوتھین علامہ کا بہت مداح تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے کیمرج میں ایک ملاقات کے دوران میں مجھ سے کہا کہ عالمِ اسلام میں ہی نہیں تمام مشرق میں اقبال جیسا اثر انداز مفکر اور کوئی نہیں۔ یہ بھی کہا کہ اقبال کے افکار تاریخ عالم کا رُخ بدل دیں گے۔ سیاسی لوگ نہیں جانتے کہ اقبال کی طرح کے شاعر کس قدر موثر ہو سکتے ہیں۔ اس لوتھین نے علامہ اقبال سے وعدہ لیا تھا کہ وہ فلسطین آ کر موتمر اسلامی میں شریک ہوں، اور

اسلامی ممالک کو اپنا پیغام دیں۔

بظاہر اچھی بات تھی۔ علامہ نے وعدہ کر لیا۔ لیکن انہیں بہت جلد اس کا احساس ہو گیا کہ یہ موتمر برطانوی سامراج کی کرشمہ سازی کا نتیجہ تھی۔ اقبال برطانوی سامراج کا سخت دشمن تھا۔ روڈز لیکچر اور اس موتمر کی تاریخیں پاس پاس تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مروّت کے پتلے تھے۔ وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ ممکن ہوا تو موتمر میں شریک ہوں گے۔ موتمر سے بچنے کا یہی طریقہ نظر آیا کہ اوکسفورڈ نہ جائیں۔

مروّت اور احسان مندی اقبال کے کردار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مہاراجہ کرشن پرشاد اور راس مسعود کے نام جو اُن کے خط ہیں ان سے یہی وصف ظاہر ہوتا ہے۔ ورنہ صاحب اقتدار لوگوں سے وہ بہت دُور بھاگتے تھے اور تعلق تو کیا کرتے بسا اوقات درشتی سے پیش آتے تھے۔ مگر کسی نے احسان کیا ہوتا تو ان کی گردن خم ہو جاتی۔

میں نے جب ان سے کہا کہ آپ موتمر میں شریک ہو کر اس کے خلاف تقریر کرتے تو فرمانے لگے کہ لوتھین کو خواہ مخواہ خوار کرنا مناسب نہ تھا۔ اس نے مجھ سے مروّت برتی تھی۔ میں نے بس شریک ہونے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اصل وجہ وہ بھی سمجھ گیا ہو گا۔

مجھے یاد ہے کہ ..... لیکن میں نے تو فقط ایک ملاقات کا حال لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ پورا ہو گیا۔ اور جو ان کی ہر ملاقات کا حال لکھا جائے تو اس کے لئے کئی کتابیں درکار ہوں گی۔ ایسی خیال افروز گفتگو ہوتی تھی کہ ہر ملاقات میں کئی نئی کتابیں لکھنے کا مواد ہوتا تھا۔ اور پھر یہ احساس کہ کوئی علمی مشکل ہو اس کا حل ان کے ہاں مل جائے گا۔ اس سے کس قدر دماغی آسائش حاصل تھی۔ اب کس کے پاس جائیں۔

قندیل اقبال نمبر ۵۰-۴-۲۱

میاں محمد شفیع (م۔ش)

اقبالؒ کے شب و روز

حضرت علامہ اقبالؒ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھتے۔ ان کے جی میں آجاتا تو کبھی فجر کی نماز پڑھ لیتے لیکن عام طور پر وہ بستر میں بیٹھے بیٹھے کلی کرتے اور پھر واضح طور پر ایسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی اور دنیا میں ہیں۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر اس دُنیا سے الگ ہو جاتے اور نفس گدازی کی زندہ تصویر نظر آتے۔

اقبال کو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایسے ہی ایمان تھا جیسے آپ اپنے ہاتھ کی پانچ اُنگلیاں دیکھتے ہیں یا جیسے کہ یہ اخبار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ آپ کو اپنے ہاتھ کی پانچ اُنگلیوں پر شاید اس قدر یقین نہ ہو جتنا اقبالؒ کو ایک خدا پر تھا۔ ایسا خدا جو الملک القدوس السلام المومن المہیمن العزیز الجبار المتکبر ہے۔ جب وہ یہ کہتے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

تو وہ واقعی دل۔ روح اور دماغ کی عمیق ترین گہرائیوں میں اس یقین سے لبریز ہو کر ایسا کہتے تھے۔

وہ اپنی روزانہ زندگی کا آغاز زندہ۔ ابدی حیّ وقیوم اللہ تعالےٰ کے لافانی ایمان سے کرتے۔ اِس تصوّر اس ایقان سے ان کی رُوح معرفت کے نُور سے جگمگا اُٹھتی۔ اور ان کی آنکھوں میں نور کا سیلاب امنڈ آتا۔ اور وُہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی زندہ تصویر بن جاتے۔

اس معرفت۔ اس ایقان۔ اس حقیقت اور اس صداقت کے لئے کہ انسان صرف اپنے خالق کی رضا جوئی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور کہ وہ بُت جو بادشاہ۔ گورنر۔ جاگیردار۔ خواجہ۔ دالی۔ ملا اور پیر کی شکل میں ہم سے اطاعت کے خراج کا مطالبہ کرتے ہیں، پاش پاش کر دینے کے قابل ہیں۔ وہ اپنے آپ کو سرورِ کائنات کا ممنونِ احسان مانتے۔ ان کی روح اس بات کا اقرار کرتی کہ حضور کی تعلیم نے جس کا منبع اور سرچشمہ کتاب عظیم ہے۔ انسانیت کو بھول بھلیوں سے نکال کر زندگی کے صراط مستقیم پر ڈال دیا ہے۔ اس احساس سے مغلوب ہو کر ان کی زبان پر درُود شریف جاری ہو جاتا۔ مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کروڑوں مرتبہ درود شریف کا ورد کیا ہے ؎

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق
لب پہ صلوٰۃ و درود دل میں صلوٰۃ و درود

ڈاکٹر صاحب کے کمرے کی بسیط خاموشی بالآخر حقّے کی گڑگڑاہٹ سے ٹوٹتی - ایک چلم حقّہ پینے تک دن چڑھ آتا اور علی بخش چائے لے آتا - ڈاکٹر صاحب چائے کی دو پیالیاں اور دو بسکٹ نوش کرتے - اس اثنا میں اخبارات آجاتے جن میں "انقلاب" اور "احسان" کو وہ خاص طور پر پڑھوا کر سُنا کرتے تھے - "احسان" مسلم لیگ کا حامی تھا - اور "انقلاب" یونی نسٹ پارٹی کا ترجمان۔

"احسان" کے ادارہ تحریر میں مولٰنا مرتضٰے احمد خاں میکش اور مولٰنا چراغ حسن حسرت شامل تھے - "انقلاب" مولٰنا غلام رسول مہر اور حضرت مولٰنا عبدالمجید سالک کے زیرِ اہتمام چھپتا تھا - یہ سارے بزرگ حضرت علامہ کے ذاتی طور پر نیاز مندوں میں شامل تھے - حضرات سالک اور مہر تو کسی زمانے میں حضرت علامہ کے یارانِ طریقت کا درجہ رکھتے تھے - لیکن اب مولٰنا مہر کی نگاہوں نے سیاسیاتِ پنجاب کو ایک مخصوص زاویہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا - جس کا نتیجہ یہ تھا کہ "انقلاب" کے اداریتی اور فکاہی کالموں میں مسلم لیگ کی "پنجابی سیاست" کا مذاق اڑتا اور دردمندانہ گزارشات کے لئے مہر صاحب کا خوں فشاں قلم دُور دُور تک چھینٹے اڑاتا تھا - یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس کا سخت ملال تھا - جس کا اظہار وہ کبھی کبھی چُھپتے ہوئے فقرات کی شکل میں فرمایا کرتے تھے۔

اخبارات سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب سونے کے کمرے سے اُٹھ کر گول کمرے میں آجاتے اور کوچ پر بیٹھ جاتے - علی بخش سامنے حقّہ دھر دیتا - جسے ڈاکٹر صاحب مزے مزے سے پیتے جاتے - گرمیوں کے موسم میں ان کے جسم پر دھوتی (لٹھے کا کھڑکڑ کرتا ہوا تہمد نہیں) کے علاوہ بنیان اور قمیض ہوتی - اور سردیوں میں

وہ جسم کو لوئی میں ڈھانپے رکھتے۔

ڈاکٹر صاحب کے ملاقاتیوں میں موچی گیٹ کے کباب فروش سے لے کر اسلامی ملکوں کے علماء اور فضلاء اور یورپ کے مستشرقین تک سبھی شامل ہوتے تھے اور ڈاکٹر صاحب ہر ایک سے اس کے ظرف کے مطابق گفتگو فرماتے مثلاً گامان پہلوان جو ڈاکٹر صاحب کی برادری میں سے تھے تشریف لائے اور کسی نجی معاملہ میں ڈاکٹر صاحب سے مشورہ طلب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے دی۔ تو رستم زماں نے ٹھیٹھ پنجابی میں جواب دیا " اچھا۔ میں اپنی والدہ کو آپ کا مشورہ بتا دوں گا۔ اگر انہوں نے بھی اتفاق کر لیا۔ تو آپ کے مشورہ کے مطابق عمل کروں گا۔"

اس بظاہر متضاد صورتِ حال پر (یعنی مشورہ تو ڈاکٹر صاحب سے مانگا جا رہا ہے اور کرنا وہ ہے جو والدہ کہے گی) ڈاکٹر صاحب چیں بہ جبیں ہونے کی بجائے قلبی طور پر خوش ہوتے اور جب گامان پہلوان اُٹھ کر چلے جاتے تو دوسرے دوستوں سے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے " دیکھئے رستم زماں ہو کر کتنی گامان کتنا بھولا اور معصوم آدمی ہے۔ کہتا تھا کہ کروں گا وہی جو ماں کہے گی۔ لیکن مشورہ مجھ سے مانگ رہا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب کے ملنے والوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہوتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ حضرت علامہ کے خاندانی معالج ڈاکٹر جمیعت سنگھ تھے۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ گھر میں چھوٹی بڑی فوری طبی امداد کے لئے ڈاکٹر جمیعت سنگھ ہی کو فون کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے غیر مسلم ملنے والوں میں

پروفیسر سی۔ ایل انند۔ سابق پرنسپل لا کالج بھی تھے۔ مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے خود فرمایا کہ جب انہوں نے گلے میں خرابی کی وجہ سے پریکٹس بند کردی۔ تو مسٹر انند ان کے پاس آئے۔ اور یہ پیش کش کی کہ وہ اپنی جمع جتھا ان (ڈاکٹر صاحب) کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ایک روز میں بیٹھا ڈاکٹر صاحب کو کسی رسالے سے مضمون پڑھ کر سنا رہا تھا کہ ایک بوڑھا سکھ جو بند گلے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ان کے کمرے میں بغیر کسی تمہید اور تکلف کے آگھسا۔ میں ان کی اس بے ساختگی سے کچھ پریشان سا ہوا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے نووارد کو دیکھتے ہی پنجابی میں کہا۔ "آیئے۔ امراؤ سنگھ بہت عرصے سے نظر نہیں آئے۔"

میں نے فوراً اندر سے لاکر کرسی ڈال دی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے امراؤ سنگھ سے کہا۔ "یہاں آکر میرے پاس بیٹھو۔" چنانچہ سردار صاحب ڈاکٹر صاحب سے گرمجوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ اور باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب گفتگو کے ساتھ ساتھ حقّے کے کش بھی لگاتے جاتے تھے۔ سردار امراؤ سنگھ نے انگریزی میں پوچھا "شعر و شاعری کا کیا حال ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "بھئی امراؤ سنگھ میں نے تو ایک دیو پال رکھا ہے جو مجھے ایک لحظہ کے لئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ جب میں ایک کام ختم کر لیتا ہوں تو پھر یہ میرے سامنے کوئی دوسرا کام لا ڈالتا ہے۔ دن رات اور صبح و شام یہی کیفیت رہتی ہے۔"

سردار امراؤ سنگھ نے پھر پوچھا۔ "اور کیسے گزرتی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "فطرت خوب انتقام لے رہی ہے۔ مجھے ترشی اور مرچ سے بڑی رغبت

تھی - اب ڈاکٹروں اور حکیموں نے اس سے قطعی طور پر منع کر رکھا ہے۔"

پھر امرتا شیر گل کے آرٹ سے باتیں شروع ہو کر نظام حیدر آباد دکن تک پھیلتی چلی گئیں۔

اس اثنا میں ڈاک آجاتی اور ڈاکٹر صاحب سارے خط باری باری پڑھوا کر سنتے - اور ضروری خطوں کا اسی وقت جواب لکھوا دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ فطرت ثانیہ بن چکی تھی کہ انہیں جو کام کرنا ہوتا تھا اسے کسی دوسرے وقت پر نہیں اٹھا رکھتے تھے بلکہ جب تک وہ کام جسے انجام دینا مقصود ہو ختم نہ کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ کام کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھنے سے جذبات اور احساسات میں پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو صحیح الخیال انسان کے لئے زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتی ہے۔

کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب ماضی کے اوراق کو الٹنا شروع کر دیتے تھے۔ اپنے خاندان، اپنے بچپن اور جوانی کے واقعات اس سادگی سے بیان فرما دیا کرتے کہ سننے والے کے دل میں ان کی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا۔ مجھ سے ایک روز فرمانے لگے۔" جب میں وکالت کرتا تھا تو ایک مؤکل مقدمہ لے کر میرے پاس آیا۔ میں نے اس کے کاغذات دیکھتے ہوئے اسے بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے اس پر بیٹھ جانے کو کہا۔ مؤکل نے جواب دیا۔ "جی میں ذات کا دھوبی ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔" یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی گری۔ اور میں مضطرب ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے جی میں کہا۔ کیا مسلمانوں کی سوسائٹی اس حد تک

پست ہو چکی ہے ۔ کہ انہوں نے اس غریب دھوبی کے دل میں یہ تاثر پیدا کر رکھا ہے کہ وہ ان کے برابر چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتا۔"

ایک دِن فرمانے لگے " میں جب بیرسٹری پاس کرنے کے بعد ولایت سے واپس لوٹا تو مجھے پتہ چلا کہ ایک مہاراجہ (میں ان کا اتا پتا جان کر نہیں دے رہا ہوں) کو ایک مسلمان وزیر کی ضرورت ہے ۔ میرے دوستوں نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اس کے لئے کوشش کروں ۔ چنانچہ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے مہاراجہ صاحب کی طرف سے ریاست میں آنے کی دعوت موصول ہوئی ۔ چنانچہ میں ریاست کے صدر مقام میں پہنچ گیا ۔ دوسرے روز شاہی مہمان خانہ میں جہاں میں ٹھہرا تھا ۔ حجامت بنانے کے لئے نائی آیا تو اس نے شیو بناتے ہوئے میرے آنے کی غرض وغایت پوچھی ۔ میں نے جواب دیا ۔ " ملازمت " اس پر نائی نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ " بس جی آپ کے کلّے ٹھلّے کا آدمی خوب موزوں رہے گا ۔" میں نے پوچھا " تمہارا مطلب ۔"

نائی کی حکایت عشق سنتے ہی ڈاکٹر صاحب، مہاراج سے ملے بغیر گاڑی سے لاہور واپس پہنچ گئے ۔

اقبال کی بلند پایہ انسانیت کا مندرجہ ذیل واقعہ ہمیشہ کے لئے میرے صفحہ قلب پر مرتسم رہے گا ۔

جاوید منزل میں کام کرنے والی خاکروبن کا چھوٹا لڑکا ننگا دھڑنگا لپکتا ڈاکٹر صاحب کی چارپائی کے پاس چلا آیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے جو اس وقت کسی گہری فکر میں تھے ۔ آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا ۔ اور پھر بے چین آواز میں اس کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس میں اور جاوید میں کیا فرق ہے۔ لیکن یہ موقع نہ ملنے کی وجہ سے دنیا میں بھنگی بنے گا۔ اور جاوید موقع ملنے سے بڑا آدمی بن جائے گا۔"

میں نے دیکھا کہ جب وہ یہ فقرات کہہ رہے تھے ان کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی نمی تھی۔

حضرت علامہ موجودہ نظام معاشیات کے سخت شاکی تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔ یہ کیا نظام ہے جس میں ایک آدمی کو رہنے کے لئے مکان پہننے کے لئے کپڑا اور کھانے کو پیٹ بھر روٹی بھی میسّر نہ ہو۔"

ایک طرف ڈاکٹر صاحب یہ ملاقاتیں۔ خوش گپیاں جاری رکھتے دوسری طرف ان کی کارگاہ فکر میں انجم ڈھلتے رہتے۔ جو شعروں کی شکل میں نذیر نیازی صاحب کی معرفت شام کو بیاض میں منتقل کر دیئے جاتے۔

شام کے چار پانچ بجے ڈاکٹر صاحب چائے کی دو پیالیاں اور ایک آدھ بسکٹ نوش جاں کرتے اور پھر حقّہ سے شغل جاری رہتا۔ چائے کے ساتھ انہیں ایک دوائی بھی کھانا ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب جب دوائی کے چمچہ کو منہ میں ڈالتے تو وہ اسے اس رغبت سے کھاتے کہ بے اختیار میرے مُنہ میں پانی بھر آتا۔ (میں نے بعد میں اس دوائی کو کئی بار چکھا۔ واقعی بڑی لذیذ تھی)

شام کو ڈاکٹر صاحب کھانا نہیں کھاتے تھے۔ تیتر کے شوربے کی ایک یا دو پیالیاں ایک آدھ خالی ٹوسٹ کے ساتھ نوش فرماتے تھے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کا ایک اندرونی حلقہ اکٹھا ہو جاتا۔ علی بخش کی مخضب مونچھوں سے لے کر بین الاقوامی

سیاسیات کے رجحانات تک زیرِ بحث آتے۔ ڈاکٹر صاحب صحت کی کمزوری آواز کے بیٹھ جانے کے باوجود رونقِ محفل ہوتی۔ اِس دور میں (۳۸ - ۱۹۳۷ء) ان کی گفتگو کا ایک اہم موضوع "جنگ کب شروع ہوگی" ہوتا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ دنیا کے مفکّروں کے سامنے جنگ کے بعد ایک اہم مسئلہ مذہب کے مستقبل کے متعلق ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ کی ہولناکیوں سے لوگوں کے مروّجہ مذہبی معتقدات متزلزل ہوجائیں گے۔ ایک مفکّر کا یہ کام ہوگا کہ وہ اس نئی صورتِ حال میں مذہب کے لئے مقام تلاش کرے۔

کافی رات گزر جانے پر دوست اور احباب ایک ایک کرکے رخصت ہوجاتے۔ اور ڈاکٹر صاحب پر بھی غنودگی طاری ہونا شروع ہوجاتی۔ اور وہ نیند کی آغوش میں چلے جاتے۔ آنکھ کھلنے پر وہ علی بخش کو جگا کر پانی پیتے یا جسم دبلنے کو کہتے۔ اور پھر سو جاتے۔ لیکن اگر ان کے ذہن میں کوئی حل طلب مسئلہ آجاتا تو رات کو پہروں پڑے اس پر سوچ بچار کرتے رہتے۔ بعض اوقات وہ شدّت احساس اور شدّت فکر سے دہکتا ہوا انگارہ بن جاتے۔

آپ نے بال جبریل میں ساقی نامہ میں یہ اشعار پڑھے ہوں گے:

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری آرزوئیں مری　　اُمیدیں مری جستجوئیں مری

یقین کیجئے ڈاکٹر صاحب کی زندگی ان اشعار کی زندہ تفسیر تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے نیازمندوں میں میرا مقام علی بخش اور رحمان سے صرف اسی قدر مختلف تھا کہ انہیں حضرت علامہ کی خدمت کی سعادت سالہا سال

سے حاصل تھی اور مجھے یہ سعادت صرف چند مہینے نصیب ہوئی۔ علم و حکمت کے اس سمندر کے سامنے میں محض اَن پڑھ تھا۔ لیکن آپ یقین مانئے کہ میں حضرت علّامہ کی انسانیت، کردار کی بلندی، پاکیزگی اور علوّ نفس سے چند مہینوں میں ہی اس قدر متأثر ہوا کہ مجھے آج تک ان سے زیادہ کسی انسان سے محبّت نہیں ہو سکی۔ اور نہ ان سے زیادہ کسی آدمی کے لئے میرے دل میں عزّت پیدا ہوئی ہے۔

مصباح الحق صدیقی

اقبالؒ کے لطائف

علامہ اقبال مرحوم نے قوم کے سامنے شعر و حکمت ہی کے موتی نہیں بکھیرے لطائف و ظرافت کے پھول بھی کھلائے ہیں۔ "بانگ درا" میں ظریفانہ کلام دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جس طرح ان کا شعر ذوق، فلسفہ و حکمت کی جلا سے آبدار ہے اسی طرح وہ لطائف اور بذلہ سنجی میں بھی دوسروں سے مختلف تھے۔

ظرافت دراصل انسان کے ذوق لطیف اور طبیعت کی شگفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اکثر آدمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ شعر و ادب میں بڑے ستھرے اور بلند پایہ خیالات کے حامل ہوتے ہیں ان کی فکر و تخیل کے چمن رنگ و نکہت سے آراستہ نظر آتے ہیں لیکن ظرافت کے میدان میں بلند معیاری قائم نہیں رکھ سکتے روایتی نوک جھونک اور سطحی اندازِ تحریر انہیں ظرافت و لطافت سے ہزلیات کے خارزاروں میں کھینچ لاتے ہیں۔ حتیٰ کہ سعدی ایسے قادر الکلام شاعر بھی جب ہزل کی طرف آتے ہیں تو اُن کا رنگ برقرار نہیں رہتا لیکن علامہ اقبال

مرحوم نے اس صنف میں بھی اپنی حکیمانہ انفرادیت قائم رکھی ان کے ظریفانہ اشعار میں بھی استعارہ و تلمیح کے وہی جوہر موجود ہیں جو ان کے حکیمانہ کلام کی رُوح تھے مثلاً گائے کے نوکدار سینگ سے وہ ہندو کی پُر پیچ سیاست کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

کہنے لگے کہ اُونٹ ہے بھدّا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

وہ مغربی طرزِ تعلیم پر طنز کرتے ہیں لیکن مقصود نظر یہاں بھی قوم کی اصلاح ہے ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے سیکھ لی فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین،
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

"نئی تہذیب" پر جو اسلامی معاشرہ کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے اس سے بہتر تبصرہ کیا ہو گا ؎

میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ان گندے "انڈوں" کو آج کل کی زبان میں آپ "ٹیڈی بوائز" بھی کہہ سکتے ہیں۔

جب حکومت پنجاب نے لاہور میں اسمبلی ہال بنوایا تو علّامہ نے کس بے ساختگی سے فرمایا ؏

کوئی تکیہ نہ تھا اس شہر میں سرمایہ داروں کا

اسمبلی ہال کے متعلق ان کی یہ پیش گوئی کیسی برمحل ثابت ہوئی؟ علامہ مرحوم کا ظریفانہ کلام بھی اصلاح و حکمت سے خالی نہیں لیکن سطور ذیل میں ان کی نثری شگفتہ گوئی کے چند نمونے حاضر ہیں جن سے نہ صرف ان کی بذلہ سنجی کی افتاد، کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی لطافت و ظرافت خالی از حکمت نہیں تھی۔

جن دنوں علامہ مرحوم کیمبرج یونیورسٹی لندن میں زیرِ تعلیم تھے چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب نے دریافت کیا:۔

"مسٹر اقبال، یہ کیا بات ہے دنیا میں جتنے پیغمبر اور بانیان مذاہب آئے وہ ایشیا ہی میں مبعوث ہوئے یورپ میں ایک بھی پیغمبر پیدا نہیں ہوا؟"

علامہ نے جواب دیا — "بھئی! اللہ میاں اور شیطان نے شروع ہی میں اپنا اپنا علاقہ مخصوص کر لیا تھا۔ اللہ نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اس لئے خدا کی طرف سے جتنے بھی پیغمبر آئے ایشیا میں مبعوث ہوئے۔"

وہ صاحب فوراً بول اُٹھے — "تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے۔"

علامہ نے بے ساختہ جواب دیا — "یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہلِ سیاست اسی کے رسول ہیں"

اس فقرے پر محفل کشتِ زعفران بن گئی اور قہقہے بکھرتے رہے۔

یورپ اور انگلستان میں آج بھی ہزاروں ایسے لوگ موجود ہیں جو برصغیر پاک و ہند کو بڑے بڑے دریاؤں، پہاڑوں، بیابانوں، شیروں، ہاتھیوں، سانپوں، بچھوؤں، سپیروں اور جنگلی آدمیوں کی سرزمین سمجھتے تھے یہ خیال شروع

شروع میں دراصل عیسائی مشنریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی افسانہ طرازیوں کی پیداوار تھا تاکہ ان لوگوں کو اپنی بہادری اور دلیری کا سکّہ جمانے کا موقع مل سکے وہ عجیب وغریب افسانے بیان کرکے یورپ کی محفلوں کو گرماتے تھے۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے تو انہیں بھی اس قسم کی حکایات کا سامنا کرنا پڑا ایک مجلس میں ایک محترمہ پوچھنے لگیں۔

"کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا ہے؟"

علّامہ نہایت سنجیدگی سے بولے — "نہیں بی جان ہر روز نہیں — ہر تیسرے دن۔"

علّامہ مرحوم خود بیان کرتے ہیں کہ انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی پر سفر کرنا پڑتا تھا یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا:۔

"ALLCHANGE" (سب بدل جاؤ)

ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا:۔

"یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیئے۔"

چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا۔ "میں نے کہا ابھی جواب دیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر چُپ ہو رہا۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ میں نے پھر کہا "ابھی جواب دیتا ہوں۔"

وہ کہنے لگے ۔ " شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں ۔"

میں نے کہا ۔ " ہاں ۔"

اس دوران میں اسٹیشن آگیا اور گارڈ پکارنے لگا " ALL CHANGE "۔۔۔۔ (سب بدل جاؤ)

میں نے کہا ۔ " بس یہی بدھ مذہب ہے ۔"

میاں بشیر احمد بیرسٹرایٹ لا مدیر " ہمایوں " بیان کرتے ہیں ۔ جب وہ اپنی میو روڈ والی کوٹھی جاوید منزل میں آ چکے تھے ۔ میں کبھی کبھی حاضر ہوتا اور " بال جبریل " کے بعض اشعار کا مفہوم دریافت کرتا ایک روز میں نے پوچھا کہ ۔ ڈاکٹر صاحب! اس شعر میں کیا ارشاد ہے :۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

میں حیران ہوں کہ تین سو سال ہوئے جہانگیر کے ہاں میخواری کا دور دورہ تھا، ڈاکٹر صاحب کیا پھر وہی رسم قدیم جاری کرنا چاہتے ہیں ؟ "

جواب دیا ۔ " نہیں، یہ شیخ مجدّد الف ثانی سرہندی کی طرف اشارہ ہے ۔ کہ مسلمانانِ ہند کے سب سے زبردست رہنما گزرے ہیں ۔"

سعید اللّٰہ نے کہا ۔ " آج کل ہندوستان میں نیشنل ازم کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے آپ کی اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے ؟ "

ڈاکٹر اقبال :۔ نیشنل ازم تو اس صورت میں ہو کہ کوئی نیشن ہو جب سرے سے " نیشن " ہی کا کوئی وجود نہیں ہے تو ازم کہاں ہو سکتا ہے میری

تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی نیشنل اینتھم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

سعید اللہ :- بندے ماترم پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی میں ہے دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر صاحب (ذرا گرمی سے) آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھئے کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک صرف ایک استثنا ہے رامائن، اور وہ بھی بعض بعض حصّوں میں۔"

عبدالواحد :- مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی زبان انگیز ہے، قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب :- "میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح منشیات سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کرے۔"

مُلّا واحدی

علامّہ اقبال
چند یادیں

علامہ اقبال کا نام میں اُس وقت سے جانتا تھا جب ان کی ایک نظم تیسری یا چوتھی جماعت کے کورس میں شامل کی گئی تھی اور دِلّی کے لڑکے اُسے مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ نظم کا پہلا شعر تھا ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

وہ جھاڑیاں چمن کی، وہ میرا آشیانہ

نظم کی شمولیت میرے لئے نئی سی بات تھی۔ اب تک اردو کورسوں پر میر و مومن، غالب و حالی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد وغیرہ کا قبضہ تھا۔ خیال نہیں گزرتا تھا کہ ان کی جگہ کوئی اور لے سکے گا۔

پھر شیخ عبدالقادر صاحب کے رسالہ مخزن میں اُن کا کلام متواتر چھپنے لگا۔ علامہ اقبال بھی شیخ عبدالقادر کی طرح شروع شروع صرف شیخ محمد اقبال کہلاتے تھے اور خواجہ

حسن نظامی صاحب شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اقبال کو لاہور کے شیخین کہا کرتے تھے۔ رسالہ مخزن نے شیخ محمد اقبال کی شہرت سکول کے طلبہ سے آگے پہنچا دی۔ اقبال، عبدالقادر، میر نیرنگ، عبدالعزیز فلک پیما، خوشی محمد (گورنر کشمیر) حسن نظامی، راشد الخیری سب بامِ شہرت پر رسالہ مخزن کے ذریعہ آئے تھے۔ مخزن ان کی نظم و نثر سے چمکتا تھا اور یہ مخزن کی مقبولیت سے چمکتے تھے۔

رسالہ مخزن کے بعد رسالہ نظام المشائخ کا نمبر تھا جس میں علامہ اقبال نے بہت لکھا۔ رسالہ نظام المشائخ کے اجراء کے وقت علامہ اقبال رسالوں سے بے نیاز ہو چکے تھے اور مستقل تصانیف کی طرف توجہ منعطف کر چکے تھے، لیکن خواجہ حسن نظامی کی خاطر سے نظام المشائخ انہیں اتنا یاد رہتا تھا کہ شکوہ جیسی نظم پہلی بار نظام المشائخ میں چھپی تھی۔

نظام المشائخ نے مجھے بھی علامہ اقبال سے قریب کر دیا تھا، مگر بس اس قدر کہ اُن کے حقیقی مقرب زندہ ہوتے تو مجھے قربت کا ادعا زیب نہ دیتا تاہم مولانائے روم کی صف کے انسان کے ساتھ تھوڑی سی قربت بھی میرے لئے موجب فخر ہے۔

نظام المشائخ کے ابتدائی پانچ سال میں نے اور خواجہ حسن نظامی صاحب نے بالکل یکجا بسر کئے تھے خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی سکونت چھوڑ دی تھی اور دلّی، کوچہ چیلان میں میرے ہاں رہنے لگے تھے۔ ان سے جو ملنے آتا تھا، وہ لازماً مجھ سے ملتا تھا۔ ان سے ملنے آنے والوں میں علامہ اقبال بھی تھے خواجہ صاحب کے اس زمانے کے ملنے والوں کو ایک ایک کر کے قضا لے گئی۔ خود خواجہ صاحب رخصت ہو گئے۔ علامہ اقبال کا قیام بیشتر حکیم اجمل خاں کے ہاں ہوتا تھا لیکن جب میرے ہاں تشریف لاتے تھے ۔ تو گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ علامہ اقبال کی بہت سی باتیں ذہن میں محفوظ ہیں۔

ایک دفعہ علامہ اقبال نے مجھے نصیحت فرمائی کہ انگریزی لٹریچر کا مطالعہ کرو۔ انگریزی زبان میں ایسا علمی ذخیرہ جمع ہے کہ پڑھ کر تمہیں محسوس ہوگا کہ پڑھنے میں دیر ناحق کی تھی۔

ایک دفعہ میں اور خواجہ حسن نظامی علامہ اقبال کو ریلوے سٹیشن لینے گئے۔ اس دفعہ انہیں میرے ہی ہاں قیام کرنا تھا۔ ریلوے قلیوں کی گفتگو سُن کر علامہ اقبال جھوم اٹھے۔ اُس زمانے میں دِلّی کے سٹیشن پر دلّی سے باہر کے قلی نہیں تھے۔ علامہ اقبال نے ہنس کر کہا۔ واحدی صاحب! آپ میری یہاں شادی کرا دیجئے۔ دِلّی کے قلیوں کی زبان یہ ہے تو دِلّی کی شریف زادیوں کی زبان کے تو کیا کہنے ہیں۔

محبُوب الٰہی کے دربار میں

ایک دفعہ میں خواجہ صاحب اور علامہ اقبال عصر و مغرب کے درمیان بستی حضرت نظام الدین سے مقبرہ ہمایوں جا رہے تھے۔ یہ راستہ اب بھی سنسان ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا مجھے اللہ اس سناٹے میں بھی نظر آتا ہے۔ خصوصاً عصر و مغرب کے درمیان کے سناٹے میں۔

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ سے علامہ اقبال کو بڑی عقیدت تھی۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں جب بیرسٹری پاس کرنے انگلستان گئے ہیں۔ تو حضرت سلطان المشائخ کے مزار پر حاضری دے کر گئے تھے۔ شیخ محمد اکرام (معاون و مدیر مخزن) نے لاہور سے اور میر غلام بھیک نیرنگ نے انبالے سے دِلّی تک مشایعت کی۔ خواجہ حسن نظامی اور منشی نذر محمد (ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز دہلی) نے استقبال کیا۔ علامہ اقبال تنہا مزار حضرت سلطان المشائخ کے سرہانے جا بیٹھے اور ایک نظم پڑھی۔ ساتھی، خواجہ صاحب سمیت کُل کے کُل باہر رہے۔ پھر ساتھیوں کی خواہش پر صحن میں مزار مبارک کے

سامنے کھڑے ہو کر نظم کو دوبارہ پڑھا۔ علامہ اقبال کی آواز میں درد اور لہجہ میں رقت تھی، جس نے ساتھیوں اور جملہ سامعین پر کیفیت طاری کر دی۔

درگاہ شریف سے علامہ اقبال خواجہ صاحب کے گھر پہنچے، گھر اور لنگر کا کھانا کھایا۔ ولایت خاں ایک نوعمر خوش گلو اور ذہین قوال موجود تھا، وہ گاتا رہا، واپسی ہوئی تو خاتم الشعرا مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تربت پر پارٹی رُکی۔ میر نیرنگ، مرزا غالب کے ایک طرف بیٹھے، اور علامہ اقبال دوسری طرف، باقی ساتھیوں نے مزار کے گرد حلقہ سا باندھ لیا۔ دن کے دو بجے تھے اور دن ستمبر کا تھا دھوپ بے حد تیز تھی اور ہوا بند تھی۔ مگر گرمی کا کسی کو خیال نہ تھا۔ ولایت خاں کو برمحل سوجھی۔ بولا۔ حضور اجازت ہو تو مرزا صاحب کی غزل عرض کروں، یہاں کسے انکار تھا۔ سرود بہ مستاں یا دو ہانید۔ اس نے غزل چھیڑی۔

دِل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

اور غزل کے ان دو شعروں نے ہل چل مچا دی۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا، ہوس بال و پر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

ہوش بجا ہوئے تو پارٹی اُٹھی، علامہ اقبال نے مرزا صاحب کی لوح تربت کو بوسہ دیا اور دِلّی کی راہ لی۔

۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں اسلامیہ ہائی سکول، انبالہ کا افتتاحی جلسہ ہوا، میر نیرنگ

صاحب نے خواجہ صاحب کو اور مجھے مدعو کیا - علامہ اقبال پٹیالے میں نواب سر ذوالفقار علی خاں (چیف منسٹر پٹیالہ) کے مہمان تھے - وہ پٹیالے سے تشریف لائے اور جلسے سے فراغت پاکر خواجہ صاحب کو اور مجھے پٹیالے لے گئے - مجھے اپنے چھوٹے بھائی بہن کے گارڈین (ولی) کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ جج دہلی کی عدالت میں جائداد کا سالانہ حساب پیش کرنا تھا میں نے عذر کیا، لیکن علامہ اقبال نے ڈسٹرکٹ جج کو جوابی تار بھیج کر تاریخ پیشی بدلوادی - سات آٹھ روز چوبیس گھنٹے یک جا رہنے کا موقع ملا - سات آٹھ روز میں علامہ اقبال نے مجھے خاصا گستاخ بنا لیا علامہ اقبال نہایت سادہ اور بے تکلف انسان تھے - ایک روز میں نے کہا - ڈاکٹر صاحب! آپ لکھتے ہیں تو صحیح اردو لکھتے ہیں، مگر بولتے ہیں — میری بات کاٹ کر فرمایا : میاں! ہر وقت زبان کا دھیان رکھوں تو مر نہ جاؤں - لکھتے وقت تو میں نگینے تراشتا ہوں -

خواجہ حسن نظامی سے علامہ اقبال کے تعلقات مخلصانہ تھے - خواجہ صاحب کے نام کے ساتھ خواجہ کا لفظ ابتداءً علامہ اقبال ہی نے استعمال کیا تھا - یورپ جانے سے پہلے اور یورپ سے آنے کے بعد تعلقات کا رنگ یکساں رہا - ان دونوں کا ملنا میں نے دیکھا ہے اور ان کے خطوط چھپ چکے ہیں اُن سے تعلقات کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے - علامہ اقبال کی کتاب اسرار خودی شائع ہوئی تو اخلاص اور تعلق میں تھوڑا سا رخنہ ضرور پڑا تھا، مگر رخنہ عارضی تھا - چنانچہ جب علامہ اقبال پتھری کی تکلیف میں مبتلا ہوئے - تو خواجہ صاحب نے ہی دِلّی بلا کر ان کا حکیم نابینا صاحب سے علاج کرایا تھا -

علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو اطلاع دی کہ گُردے کا آپریشن کرانے سری نگر (کشمیر) جا رہا ہوں - پنجاب کا سب سے بڑا انگریز سرجن آج کل سری نگر میں ہے - سر سکندر

حیات اس وقت پنجاب کے ایکٹنگ گورنر تھے، خواجہ صاحب نے علامہ اقبال کو جواب دیا کہ ذرا حکیم نابینا کا تجربہ کرتے جائیے۔ علامہ اقبال دلی تشریف لائے۔ خواجہ صاحب نے انہیں بیگم کے باغ کے پاس ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور حکیم نابینا صاحب کو لاکر دکھایا ناقابلِ بیان تکلیف تھی۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ حکیم نابینا صاحب نے دوا دی۔ اللہ کے فضل سے تین دن میں تکلیف جاتی رہی۔ پتھری ریزہ ریزہ ہو کر نکل گئی۔ آٹھویں دن حکیم نابینا صاحب نے فرمایا اب آپ لاہور جائیے، دوا لاہور پہنچتی رہے گی۔

پتھری نکالنے کی دوا مفرد تھی۔ کسی جڑ یا بوٹی کا سفوف تھا۔ لاہور مرکب دوائیں جاتی تھیں۔ میں حکیم صاحب سے دوائیں منگاتا تھا اور بھیجتا تھا۔ دو ڈھائی مہینے مرکب دواؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ علامہ اقبال نے پتھری کی شکایت پھر کبھی نہیں کی اور علامہ اقبال وقتِ آخر تک حکیم نابینا صاحب اور خواجہ صاحب کے شکر گزار رہے۔

نوائے وقت ۲۱ اپریل ۱۹۶۲ء